معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ روپے فی شمارہ ۱۲ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

فہرست ششماہی

مضمون نگاران معارف

۱۷۴ ویں جلد

ماہ جولائی ۲۰۰۴ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۷۴ ماہ جمادی الاول ۱۴۲۵ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۰۴ء عدد ۱

فہرست مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

ادبیات

ای میل : shibli_academy@rediffmail.com

شذرات

ساجد علی میموریل کمیٹی گورکھ پور کے ایک جلسے میں اردو رابطہ کمیٹی کے روح رواں اور اردو کے مجاہد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے بڑی جرأت سے یہ کہا ہے کہ ''اردو کا جو منظر نامہ ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے وہ اس بات کی نفی کرتا ہے کہ اردو ترقی کر رہی ہے، آج لکھنؤ جیسے شہر میں اردو اور مذہبی تقریبات کے بینر اور اشتہار دیوناگری رسم الخط میں شایع ہو رہے ہیں اور قبرستانوں میں لوح مزار بھی ہندی میں لکھے جا رہے ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ اردو ترقی کر رہی ہے ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو اردو لیڈر اپنے ذاتی مفادات کے لیے بول رہے ہیں'' یہ کس قدر شرم ناک ہے کہ اردو ہی کی بہ دولت اردو والے ہر قسم کے اعزاز سے سرفراز ہوتے اور گوناگوں فایدے حاصل کرتے ہیں مگر اس کے استعمال سے اتنا حذر کرتے اور اس کی ترقی کے لیے اپنی کسی مصلحت اور مفاد کو چھوڑنا اور قربان کرنا گوارا نہیں کرتے، یونیورسٹی کے یہ اردو اساتذہ اور اردو ادارے کے سربراہ ہی تو تھے جو کیا کیا ارمان لے کر ایک وزیر کی حمایت میں ہونے والے جلسے میں پہنچ کر گل افشانی گفتار کر رہے تھے اور اب اس کی جو تاویلیں کر رہے ہیں ان سے غالباً وہ خود بھی مطمئن نہ ہوں گے تو دوسروں کو بھلا کیا مطمئن کریں گے؟۔

اتر پردیش میں اردو کی سخت تشویش ناک حالت دیکھ کر بھی اردو کے ان کرم فرماؤں کے کانوں پر جوں نہیں رینگ رہی ہے، وہ ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے لیکن یہاں ایک بھی اردو میڈیم اسکول نہیں، اردو اساتذہ کا تقرر عرصے سے نہیں ہو رہا ہے، نہ اردو میں عرضی دعوے اور درخواستیں دی جاتی ہیں اور نہ ان کے جواب اردو میں دیے جاتے ہیں، رجسٹریشن آفس میں اردو میں تحریر کیے گئے کاغذات اور دستاویزات قبول نہیں کیے جاتے، اہم سرکاری قوانین اور اعلانات اردو میں شایع نہیں کیے جاتے ہیں، گزٹ کے اردو ترجمے کی اشاعت مدت سے موقوف ہے، اردو کے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے معطل پڑے ہیں، اتر پردیش اردو اکادمی کی کوئی کمیٹی ہی نہیں ہے، وہ کتابوں کی طباعت کے لیے مالی امداد یا مطبوعہ کتابوں پر انعام اور طلبہ کے وظایف کیسے دے گی، ملازمین کے مطالبات اور بقایا جات کئی کئی برس گزرنے کے بعد بھی ادا نہیں کیے جاتے، فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کا حال اس سے

بھی بدتر ہے، وہاں نہ کمیٹی، نہ چیرمین اور نہ گرانٹ ہے، آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن سے اردو خبروں اور پروگرام کے اوقات کم سے کم تر ہو گئے ہیں، نئے پروگرام کی بات ہی کیا؟ محکمہ اطلاعات ونشریات کے اردو ماہ نامہ نیا دور کے صفحات ۴۸ سے ۳۲ اور قیمت بڑھا کر دس روپے اور اشاعت کم کردی گئی ہے، نہ مضمون نگاروں کو رسالہ ملتا ہے، نہ اعزازی اور تبادلے میں بھیجا جاتا ہے، برسوں گزرنے پر بھی مضامین کے معاوضے نہیں دیے جاتے، منصفی کے امتحان میں اردو پرچہ ختم کردیا گیا، قریباً ایک سال سے اتر پردیش میں سیکولر حکومت قایم ہے، ہم حیران ہیں کہ اردو سے اردو نواز وزیر اعلا کی یہ سرد مہری کب تک رہے گی اور اردو والوں کی یہ بے حسی کب ختم ہوگی اور وہ کب تک اردو کی اس حالت کو انگیز کریں گے۔

لوک سبھا انتخابات سے پہلے بی جے پی اور اس کے نفس ناطقہ مسٹر اٹل بہاری واجپئی نے مسلمانوں کو لبھانے اور ورغلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، سبز باغ دکھا کر اور خوش نما اور دل فریب وعدے کر کے یہ تاثر دیا کہ اب ان کی پارٹی سیکولر ہوگئی اور ہندوتوا چھوڑ چکی ہے اور مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کا خیال اس نے دل سے نکال دیا ہے، اس وقت بی جے پی کے شدت پسند اور آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے لوگوں نے مسلمانوں کو رجھانے کی کوششوں کا برا نہیں مانا تھا، سب ہی چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو بہلا پھسلا اور دھوکا فریب دے کر ان کے ووٹ حاصل کر لیے جائیں مگر مسلمانوں میں جو اہل نظر اور نکتہ شناس تھے وہ ان پر فریب چالوں کو سمجھ گئے تھے اور جانتے تھے کہ بی جے پی نے اپنے فرقہ پرستانہ گھناؤنے چہرے پر نقاب ڈال لیا ہے، انتخابات کے بعد باجپئی جی کو اپنی کہی ہوئی باتوں سے پھر جانے میں دیر نہیں لگے گی لیکن بزم کے تماشائیوں نے ان کے خوش نما اور دل فریب وعدوں کا ضرور اعتبار کرلیا تھا اور وہ بی جے پی کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ان کا یہ نشہ ممکن ہے اب بھی نہ اترا ہو لیکن باجپئی صاحب نے منالی میں بی جے پی کی شکست کا تجزیہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس پر بی جے پی اور آر ایس ایس کے حلقہ میں ایک کھلبلی مچ گئی اور انہیں بہت کچھ سخت سست سننا پڑا، چنانچہ ممبئی میں قومی مجلس عاملہ کے اجلاس میں صدر کو کہنا پڑا کہ ہم نے ہندوتوا کو نہ چھوڑا ہے اور نہ آیندہ چھوڑیں گے، کیا مسلمانوں کو یہ بات یاد رہ جائے گی یا آیندہ معمولی فایدوں کے لیے ہر ناعق کی پکار پر اس کے پیچھے دوڑنے لگیں گے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کانگریس کا پچھلا ریکارڈ بہت خراب رہا ہے، اس کے پرانے لیڈروں سے کسی کو خوش فہمی نہیں ہو سکتی، اگر وہی عناصر پھر اس پر حاوی ہو گئے تو وہ اسے اس کے صحیح مقاصد اور سیکولرزم کے راستے سے ہٹا دیں گے مگر مسز سونیا گاندھی، مسٹر من موہن سنگھ اور پھر حلیف پارٹیوں کے بے داغ اشخاص سے اس کی امید کی جارہی ہے کہ بی جے پی نے ملک کو جس غلط راستے پر ڈال دیا ہے اس سے اس کو نکالنے میں وہ کامیاب ہو جائیں گے، بی جے پی کے دور میں جو گھپلے، گھوٹالے اور بھیانک واقعات ہوئے یا اس کے دور سے پہلے ہوئے، نئی حکومت طے کرے کہ اب ان کا اعادہ نہ ہوگا، دو برس پہلے گجرات میں ہونے والے ہول ناک فساد کو بی جے پی نے گودھرا کا ردعمل قرار دے کر ختم کردینا چاہا اور قومی جمہوری محاذ کی حکومت نے اس کی جانچ میں مختلف طریقوں سے اس لیے رخنے ڈالے کہ عام طور پر خیال کیا جارہا ہے کہ گودھرا واقعہ کسی سازش کا نتیجہ ہے، خوشی ہے کہ نئے ریل وزیر نے اس سازش کا پتا لگانے کا بیڑا اٹھایا ہے، اگر وہ اس میں کامیاب ہوئے تو یہ ان کا بڑا کارنامہ ہوگا، حکومت کو ان کی پوری مدد کرنی چاہیے اور دوسرے معاملات میں بھی لیپا پوتی کے بجائے جرأت مندانہ قدم اٹھانا چاہیے تاکہ بی جے پی کا بدترین دور ملک کو پھر نہ دیکھنا پڑے۔

ڈاکٹر ظفر الدین پبلک ریلیشنز افسر مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے خط سے معلوم ہوا کہ یونی ورسٹی میں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت ڈگری کورسوں بی اے، بی ایس سی، بی کام میں داخلوں کا سلسلہ جاری ہے، وہ تمام طلبہ و طالبات داخلے کے اہل ہیں جنھوں نے کسی سرکاری یا حکومت سے منظور شدہ ادارے سے 10+2 یا انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی کوئی کورس مکمل کیا ہو، ملک کے کسی بھی حصے میں مقیم افراد داخلہ لے کر گھر بیٹھے اپنی تعلیمی لیاقت میں اضافہ کر سکتے ہیں، ایک سالہ ڈپلوما کورس میچ انگلش اور پانچ چھ ماہی سرٹی فکیٹ کورسوں غذا اور تغذیہ، اہلیت اردو بہ ذریعہ ہندی اور بہ ذریعہ انگریزی فنکشنل انگلش اور کمپیوٹنگ میں بھی داخلے ہو رہے ہیں، تمام کورسوں میں داخلے کی آخری تاریخ ۱۴/ اگست ہے، یونی ورسٹی نے تمام کورسوں کے لیے مشترکہ پراسپکٹس مع درخواست فارم شائع کیا ہے جو ملک بھر میں قائم یونی ورسٹی کے تمام ریجنل اور اسٹڈی سنٹروں پر قیمتاً دست یاب ہیں، بہ ذریعہ ڈاک صرف یونی ورسٹی ہیڈ کوارٹر ہی سے منگایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

مقالات

قرآن مجید کی قسمیں

از:- ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمسی ☆

قسم کے اصل معنی (قطع) کاٹنے کے ہیں، قسمت الشئی و قسمته اسی معنی میں مستعمل ہے اور قطع کا لفظ شک و شبہ کی نفی کے لیے عام ہے، عربی زبان میں اس کے شواہد بہت ہیں، صریمہ، جزم، قول، فصل، ابانۃ، صدع، قطع وغیرہ سارے الفاظ میں یہ حقیقت موجود ہے، ایک ہی روح ان تمام الفاظ کے اندر ساری ہے، پھر قولاً کسی بات کو قطعی طور پر واضح کردینے کے لیے ''قسم'' ان میں سے مخصوص ہو گیا اور اس کا استعمال باب انفعال سے ہوا، کیوں کہ باب انفعال میں مبالغے کی خاصیت پائی جاتی ہے، مثلاً اسفر الصبح اور اس کے لیے مقسم بہ کوئی ضروری شرط نہیں خواہ مقصود بیان خبر ہو یا اظہار عزیمت۔(۱)

چوں کہ کلام میں قسم بہ کثرت مستعمل ہے اس لیے اختصار کی خاطر فعل قسم کو حذف کر دیتے ہیں اور ''ب'' پر اکتفا کرتے ہیں، پھر اسمائے ظاہرہ میں ''ب'' کی جگہ ''و'' آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسماء کے ساتھ ''ت''۔

ابن قیم لکھتے ہیں:

والقسم لما کان یکثر فی الکلام اختصر، فصار فعل القسم یحذف و یکتفی بالباء، ثم عوض من الباء الواو فی الاسماء الظاهرة والتاء فی اسماء اللّٰه کقوله: (و تاللّٰه لاکیدن اصنامکم) وقد نقل ترب الکعبة واما الواو فکثیرة۔(۲)

☆ شعبۂ اسلامیات گورنمنٹ کالج لاہور، پاکستان۔

یہ تینوں الفاظ معیت وصحبت کا مفہوم ظاہر کرنے والے حروف ہیں۔

اقسام القرآن پر علما کی تصانیف اقسام القرآن پر علامہ ابن قیم نے ''التبیان فی اقسام القرآن'' تحریر کی جب کہ مولانا حمید الدین فراہی نے ''الامعان فی اقسام القرآن'' لکھی، فارسی میں ابوالقاسم رزاقی کی ''سوگندھای قرآن'' بھی اسی موضوع پر علمی کتاب ہے، مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اقسام القرآن پر بحث کی، علوم القرآن پر لکھی گئی کتب جیسے الاتقان، البرہان وغیرہ میں بھی یہ موضوع زیر بحث آیا ہے۔

ذیل میں قرآنی قسموں کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے چند مفکرین کی آرا درج کی جاتی ہیں۔

۱-امام فخرالدین رازی (متوفی: ۶۰۶): سورہ والصّٰفّٰت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

انه تعالی قرر التوحید و صحة البعث والقیامة فی سائر السور بالدلائل الیقینیة، فلما تقدم ذکر تلک الدلائل لم یبعد تقریرها فذکر القسم تاکید الما تقدم لا سیما والقرآن انما انزل بلغة العرب واثبات المطالب بالحلف والیمین طریقة مألوفة عند العرب۔(۳)

اللہ تعالی نے دوسری سورتوں میں نہایت یقینی دلایل سے توحید، بعث اور قیامت کو ثابت کردیا ہے، چوں کہ ان دلایل کا ذکر کچھ ہی پہلے ہو چکا ہے اس لیے ان ہی پہلے بیانات کی تاکید کے لیے قسم کو ذکر کیا ہے اور یہاں خصوصیت سے یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ قرآن عربی زبان میں اترا ہے اور مطالب کو قسم کے ذریعے ثابت کرنا اہل عرب کا معروف طریقہ ہے۔

سورۃ الذاریات میں لکھتے ہیں کہ تمام قسمیں جو اللہ تعالی نے بیان کی ہیں وہ دراصل دلایل ہیں...... رہی یہ بات کہ اس کو قسم کی صورت میں کیوں پیش کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب اپنی بات قسم سے شروع کرتا ہے تو مخاطب کو خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی اہم بات کہنے والا ہے، اس کو خاص اہتمام سے سننا ہے، پس اسی اصول پر یہاں بھی کلام کا آغاز قسم سے ہوا اور دلیل قسم کے لباس میں پیش کی گئی۔

سورۃ التین میں لکھتے ہیں:

۱- تین اور زیتون سے مراد اگر مشہور پھل لیے جائیں تو پھر ان کی قسم کھانے کی وجہ ان

کے مصالح وفواید ہیں۔

والجزم بان اللہ تعالی اقسم بهما لما فیهما من المصالح والمنافع۔(۴)

۲- اگر تین سے مراد وہ پہاڑ لیا جائے جس کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے اور زیتون سے مراد وہ پہاڑ لیا جائے جہاں اکثر انبیاے بنی اسرائیل مبعوث ہوئے اور طور سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کا مقام اور بلد امین سے مکہ مراد ہے تو اس صورت میں قسم کی وجہ درحقیقت انبیا کی تعظیم اور ان کے مراتب ودرجات کی بلندی ہے۔

فیکون المراد من القسم فی الحقیقة تعظیم الانبیاء واعلاء درجاتهم۔

۲-علامہ ابن قیم (متوفی: ۷۵۱): ارشاد فرماتے ہیں:

فهو سبحانه یقسم علی اصول الایمان التی یجب علی الخلق معرفتها، تارة یقسم علی التوحید وتارة یقسم علی ان القرآن حق، وتارة علی ان الرسول حق وتارة علی الجزاء والوعد والوعید، وتارة علی حال الانسان۔(۵)

اللہ تعالی ایمان کی ان اصولی باتوں پر قسم کھاتا ہے جن کی معرفت خلق پر واجب ہے، چنانچہ کبھی توحید پر قسم کھاتا ہے، کبھی قرآن کے حق ہونے پر کبھی رسول کی صداقت پر، کبھی جزاء اور وعد و وعید کے وقوع پر اور کبھی انسان کے حال پر۔

اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

اللہ تعالی بعض چیزوں کی بعض چیزوں پر قسمیں بیان کرتا ہے اور اس کی قسمیں اپنی ذات کی ہوا کرتی ہیں جو خاص صفات سے متصف ہے یا ان نشانیوں کی جو اس کی ذات وصفات کو مستلزم ہیں اور یہ جو کہیں کہیں بعض مخلوقات کی قسم کھائی ہے تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مخلوقات اللہ تعالی کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں۔(۶)

۳-ابوالقاسم القشیریؒ: اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ مخلوق کی قسم کھانا منع ہے تو اللہ تعالی نے کیوں ان کی قسمیں کھائیں، اس کے درج ذیل تین جواب لکھتے ہیں۔

۱- انه علی حذف مضاف: ای،

ان قسموں میں مضاف حذف ہے یعنی والفجر و

ورب الفجر، ورب التين و كذلك الباقي۔

رب الفجر اور والتین ورب التین ہے، یہی حال باقی سب کا ہے۔

۲- ان العرب كانت تعظم هذه الاشياء وتقسم بها، فنزل القرآن على ما يعرفون۔

اہل عرب ان اشیا کی تعظیم کرتے تھے اور ان کی قسمیں کھاتے تھے اور قرآن ان کے عرف کے مطابق نازل ہوا ہے۔

۳- ان الاقسام انما تجب بان يقسم الرجل بما يعظمه، او بمن يجله، وهو فوقه، والله تعالى ليس شيئ فوقه، فاقسم تارة بنفسه، وتارة بمصنوعاته، لانها تدل على باريء وصانع۔ (۷)

قسم کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس چیز کی قسم کھائے جسے وہ عظیم وجلیل خیال کرتے تھے اور جو اس سے بالا وبرتر ہوتی تھی اور اللہ تعالی سے بلند وبرتر کوئی نہیں اس لیے وہ کبھی خود اپنی ذات کی اور کبھی اپنی مصنوعات کی قسم کھاتا ہے کیوں کہ یہ اس کے صانع ہونے کی دلیل ہیں۔

۴- علامہ الطباطبائی: ممتاز شیعہ عالم سید محمد حسین الطباطبائی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

واذا تاملت الموارد التي اورد فيها القسم في كلامه تعالى وامعنت فيها وجدت المقسم به فيها حجة دالة على حقية الجواب كقوله تعالى في الرزق (فورب السماء والارض انه لحق) (۸) فان ربوبية السماء والارض هي المبدء لرزق المرزوقين، وقوله (لعمرك انهم لفي سكرتهم يعمهون) (۹) فان حياة النبي ﷺ الطاهرة المصونة بعصمة من الله دالة على سكرهم وعمههم ..... وعلى هذا النسق سائر ما ورد من القسم في كلامه تعالى (۱۰) وان كان بعضها لا يخلو من خفاء يحوج الى امعان من النظر كقوله: (۱۱) والتين والزيتون۔ (۱۲)

اگر تم قرآن مجید میں وارد شدہ قسموں پر غور وفکر کروگے تو مقسم بہ کو جواب قسم کے لیے حجت پاؤ گے، جیسے رزق کے بارے میں قرآن میں ہے "آسمان وزمین کے رب کی قسم بے شک وہ حق ہے" بے شک آسمان وزمین کی ربوبیت ہی تو بندوں کے رزق کا مبدأ ہے اور جیسے قول باری تعالی ہے "تیری عمر کی قسم وہ اپنے نشے میں بھٹک رہے ہیں" نبی کی معصوم زندگی ان کے نشے میں ہونے اور بھٹکے ہوئے ہونے پر دلالت کرتی ہے ..... غرض اسی انداز پر قرآن مجید کی دوسری قسمیں بھی ہیں، گو بعض قسمیں قدرے مخفی ہیں

اور ان کو سمجھنے کے لیے گہرے غور وفکر کی ضرورت ہے جیسے والتین والزیتون۔

۵- ذیل میں مفسرین نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے درج کیا جاتا ہے، تفسیر نمونہ میں سورۃ الصّٰفّٰت کی تفسیر میں ہے:

"یہ قرآن مجید کی وہ پہلی سورہ ہے جس کا آغاز قسم سے ہوتا ہے اس کی پُر معنی اور فکر انگیز قسمیں انسان کے فکر کو اپنے ساتھ اسی جہان کے مختلف گوشوں کی طرف کھینچ لے جاتی اور حقائق کو قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ خدا سب سے بڑھ کر راست گو ہے اور اسے قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر قسم مومنین کے لیے ہے تو وہ قسم کے بغیر بھی سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور اگر منکرین کے لیے ہے تو وہ ان قسموں کو خدا کا کلام نہیں مانتے"۔

لیکن قرآن کی تمام آیات میں جن سے اس کے بعد ہمیں کبھی کبھی واسطہ پڑے گا، دو نکات کی طرف توجہ سے قسم کا مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

پہلا یہ کہ قسم ہمیشہ قابل قدر اور اہم امور کے بارے میں کھائی جاتی ہے۔

اسی بنا پر قرآنی قسمیں ان امور کی عظمت اور اہمیت کی دلیل ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے اور یہی "مقسم بہ" یعنی وہ چیز جس کی قسم کھائی گئی ہے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور وفکر کا سبب بنتا ہے، ایسا غور وفکر جو انسان کو نئے حقائق سے آشنا کرتا ہے۔

دوسرے قسم ہمیشہ تاکید کے لیے آتی ہے اور اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ امور جن کے لیے قسم کھائی جا رہی ہے ایسے ہیں جن کے بارے میں تاکید شدید ہے، اس سے قطع نظر جس وقت کہنے والا اپنی بات کو دوٹوک طریقے سے بیان کرے تو نفسیاتی طور پر سننے والے کے دل پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے لہذا قرآن کی ہر قسم مومنین کو زیادہ قوی اور منکرین کو زیادہ نرم کر دیتی ہے۔ (۱۳)

۶- شاہ ولی اللہ: قسم خوردن بچیزے برائے اثبات ہماں چیز یا لازم آں چیز کنایت است بآنکہ

ایں چیز خود دلیل است چنانکہ گویند قسم بابِ میگون تو و زلف شبگون تو کہ تو - معشوق دلربائی ۔ (۱۴)

۷- علامہ حمید الدین فراہی (۱۹۳۰ء): ان کی تحقیق کے مطابق قسم کی تین اقسام ہیں:

۱- قسم، مقسم بہ یا مخاطب کی تعظیم کے پہلو سے ۔ ۲- قسم، مقسم بہ کی تقدیس کے پہلو سے ۔ ۳- قسم بہ غرض استدلال ۔ (۱۵)

ان کے نزدیک قرآن کی قسمیں تیسری نوعیت کی ہیں اور یہ اسلوب عرب و عجم دونوں میں معروف ہے۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ میں بالعموم نہایت واضح نسبت ہوتی ہے، قرآن میں ان قسموں کو ایسے قالب میں پیش کیا گیا ہے کہ صاحب نظر بادنا تامل مقسم علیہ کے ساتھ ان کے تعلق کو پالیتا ہے۔

۸- علامہ شبیر احمد عثمانی (متوفی ۱۹۴۹ء): واضح ہو کہ دنیا میں کئی قسم کی چیزیں ہیں جن کی قسم لوگ کھاتے ہیں، اپنے معبود کی، کسی معظم و محترم ہستی کی، کسی مہتم بالشان چیز کی، کسی محبوب یا نادر شے کی، اس کی خوبیوں یا ندرت جتانے کے لیے، جیسے کہتے ہیں فلاں کی قسمت کی قسم کھایئے، پھر اہل بلاغت اس کی بھی رعایت کرتے ہیں کہ مقسم بہ، مقسم علیہ کے مناسب ہو، یہ ضروری نہیں ہر جگہ مقسم بہ کو مقسم علیہ کے لیے شاہد ہی گردانا جائے جیسے ذوق نے کہا ۔

اتنا ہوں تیری تیغ کا شرمندۂ احسان سر میرا تیرے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا

یہاں اپنے سر کے نہ اٹھ سکنے پر محبوب کے سر کی قسم کھانا کس قدر موزوں ہے، شریعت حقہ نے غیر اللہ کی قسم کھانا بندوں کے لیے حرام کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ کی شان بندوں سے جداگانہ ہے، وہ اپنے غیر کی قسم کھاتا ہے اور عموماً ان چیزوں کی جو اس کے نزدیک محبوب یا نافع یا وقیع و مہتم بالشان ہوں یا مقسم علیہ کے لیے بہ طور شاہد و حجت کام دے سکیں ۔ (۱۶)

۹- مولانا غلام اللہ خاں: سورہ زخرف کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قسم کی دو قسمیں ہیں:

۱- جس میں مقسم بہ کو مافوق الاسباب قادر اور عالم الغیب سمجھ کر قسم کھائی جاتی ہے اور اس میں یہ تصور ہوتا ہے کہ اگر اس کی مخالفت کی گئی تو وہ ضرر پہنچائے گا یہ قسم غیر اللہ کی جائز نہیں۔

۲- مقسم بہ کو جواب قسم پر بہ طور شاہد پیش کیا جاتا ہے ۔ (۱۷)

۱۰- مولانا عبد الماجد دریابادی: عربی اسلوب بلاغت میں قسم ایک ادبی صنعت و فن کاری ہے اور بہترین ادیب و شاعر اس سے حسب موقع آزادی سے کام لیتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی قسمیں مذاق عرب پر بالکل گراں نہیں گذریں اور جو اہل زبان مخالفت میں غرق اور اعتراض و نکتہ چینی کے لیے تلے بیٹھے رہتے تھے ان میں سے بھی کسی نے یہ نہ پوچھا کہ خدا کے کلام میں یہ مخلوقات کی قسمیں کیسی؟ اور قسموں کے فلسفہ یا ان کی توجیہات عقلی پر توجہ صرف عجمی اور ہندی اہل علم نے شروع کی ۔ (۱۸)

۱۱- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۱۳۹۹ھ): اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم اس کی عظمت یا اس کے کمالات و عجائبات کی بنا پر نہیں کھائی ہے بلکہ اس بنا پر کھائی ہے کہ وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے ۔ (۱۹)

قرآن مجید میں جہاں بھی شک یا انکار کرنے والوں کو کسی حقیقت غیر محسوس کا یقین دلانے کے لیے کسی چیز یا بعض چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے وہاں قسم دراصل استدلال کی ہم معنی ہوتی ہے یعنی اس سے مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ چیز یا چیزیں اس حقیقت کے صحیح اور برحق ہونے پر دلالت کر رہی ہیں ۔ (۲۰)

۱۲- ڈاکٹر محمد اشرف فاضلی: "قسم بیان کی شان کی بڑھانے کے لیے بھی ہوتی ہے اور شہادت کے لیے بھی ہوتی ہے" ۔ (۲۱)

"قسم سے حق کی وضاحت میں مدد لی جاسکتی ہے، اللہ کی قدرت کو ہر مقام پر دیکھا جاسکتا ہے" ۔ (۲۲)

۱۳- پیر محمد کرم شاہ (متوفی ۱۴۱۸ھ): نے ضیاء القرآن میں اقسام القرآن کے حوالہ سے تفصیلی بحث نہیں کی، البتہ سورۃ الفجر میں ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی قسم بہ طور استدلال کے قائل ہیں،

"ان تمام قسموں کا جواب لتبعثن محذوف ہے یعنی تمہیں ضرور زندہ کر کے اٹھایا جائے گا، یہ ساری چیزیں جس نظم و نسق اور باقاعدگی کے ساتھ رونما ہوتی رہتی ہیں وہ اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ یہ اندھی بہری فطرت کی کارستانی نہیں بلکہ ایک قادر، حکیم اور علیم ذات کا ارادہ ان کو معرض وجود میں لا رہا ہے ۔ (۲۳)

محققین کے درج بالا اقوال سے قرآنی قسموں کی نوعیت کے مختلف پہلو نکھر کر سامنے آگئے، قسم کھانا اہل عرب میں معروف و مشہور تھا، اسی وجہ سے انہوں نے قرآنی قسموں پر کوئی اعتراض نہ کیا، قرآن کی قسمیں اپنے اندر اعجاز و بلاغت کی شان لیے ہوئے ہیں۔

قرآن کریم نے بعض مقدس اشیا کی قسموں کا تذکرہ کیا ہے اور اس میں بعض مظاہر فطرت کی قسمیں بھی مذکور ہیں، لیکن یہ قسمیں مخلوقات کے شرف و بزرگی کی جہت سے نہیں کیونکہ یہ شرف مخلوق کی نسبت سے ہے نہ کہ خالق کی نسبت سے، اگرچہ خالق کائنات نے اپنی بعض مخلوقات کو عظمت و شان عطا فرمائی، اسی طرح ان میں اگر تقدس و تعظیم کا پہلو پایا جاتا ہے تب بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ خالق و مالک نے ان کے تقدس کی وجہ سے قسم کھائی ہے، بعض اہم امور جیسے قیامت، توحید اور رسالت پر قسمیں کھائی گئی ہیں اگر وہ تاکید کے لیے ہیں تو اہل ایمان پہلے ہی ان امور پر ایمان رکھتے ہیں اور کفار انکار کر رہے ہیں، ان قسموں سے کون سی تاکید ہوگی؟۔

قرآن کریم کی تمام قسمیں جواب قسم کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہیں، مقسم بہ اور مقسم علیہ میں یہی وہ ربط ہے جس نے انسان کے لیے غور و فکر اور فہم و تدبر کے دروازے کھولے، قرآن کا یہ قاعدہ ہے کہ جن حقائق کو وہ انسان کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے ان کی شہادت میں گرد و پیش سے چند نمایاں محسوس و غیر محسوس، شہادتیں پیش کرتا ہے اور یہی اسلوب ان قسموں کا ہے جن چیزوں کو مکی سورتوں میں (عموماً) قسم کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، قرآن میں دیگر مقامات پر ان مظاہر کو پیش کرکے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، اہل عرب میں بھی بہ طور استدلال قسم کھانے کا رواج تھا اسی وجہ سے ان میں ایسی چیزوں کی قسموں کا ذکر بھی ملتا ہے جو مقدس و معظم تھیں نہ وہ معبود سمجھی جاتی تھیں، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قسم بہ طور شاہد اہل عرب میں رائج تھی، اگر قرآن کی بیان کردہ تمام قسموں کے لیے ایک اصول بنایا جائے تو ''قسم بہ طور استدلال'' ہی بہترین اصول ہے جس سے ان قسموں پر وارد ہونے والے اعتراضات بھی ختم ہوجاتے ہیں اور ''نظم قرآن'' کا اسلوب بھی واضح ہوجاتا ہے۔

قرآن میں قسموں کی تعداد علامہ طنطاوی کی تحقیق کے مطابق قرآن مجید میں چالیس قسمیں ہیں، ان میں بیس عالم سفلیات کی ہیں اور بیس عالم علویات کی، اس طرح قرآن نے مساوی طور

پر زمین و آسمان کی چیزوں پر غور و فکر کی دعوت دی ہے (ان اللہ امر عبادہ واوجب علیھم فی العلویات والسفلیات بالتساوی) ان کے نزدیک یہ اقسام مفاتیح العلوم ہیں اور ان پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے (جعلنا ھذہ الاقسام مفاتیح العلوم لانہ ذکر جواھر الاشیاء فیھا لیلفت الیھا العقول، ویحرض علی البحث علیھا العلماء والامم)۔

عالم سفلیات کی بیس اقسام درج ذیل ہیں:

الفجر، والفلق، والصبح، والشمس، والضحی، والنهار، والعصر، والليل، والليالي العشر وبالنجم، وبمواقع النجوم، ورب المشارق والمغارب، وبالشفق والليل وماوسق، وبالقمر، وبالسماء ذات البروج، وبالنازعات غرقا، والناشطات نشطا، والسابحات سبحا، فالسابقات سبقا، فالمدبرات امرا۔

عالم علویات کی اقسام درج ذیل ہیں:

الرياح الذاريات، والرياح الحاملات، وبالارض وماطحاها، وبالتين والزيتون وهذا البلد الامين، وبالخيل وبالشاهد وبالمشهود، وبيوم القيامة، ويوم الجزاء، ويوم الميعاد، وبالكتب المسطرة المنشورة، وبالبحر، وبكل ماخلق وبما تبصرون ومالا تبصرون، وبوالد وبما ولد، ونفس وما سواها۔ (۲۴)

جواب قسم کے حروف قرآن مجید کی جملہ اقسام میں جواب قسم کے لیے درج ذیل سات حروف آئے ہیں:

۱- ان (مشددہ) جیسے والفجر ولیال عشر...... ان ربک لبالمرصاد۔

۲- ما نافیه جیسے ما ودعک ربک و ما قلی۔

۳- ان (مخففة) جیسے تاللہ ان کنا لفی ضلال مبین۔

۴- لام (مفتوحہ) جیسے فوربک لنسئلنھم اجمعین۔

۵- قد جیسے قد افلح من زکاھا۔

۶- لا، نافیه جیسے واقسموا باللہ جھد ایمانھم لا یبعث اللہ من

یموت ۔

۷- بل جیسے ق والقرآن المجید بل عجبوا ان جاءهم ...... (۴۵)

قرآن کریم کی جن سورتوں میں قسموں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں بیان کردہ اصول کے مطابق اب قسم و جواب قسم میں ربط وتعلق کو مختلف مفسرین کی تحقیقات کی روشنی میں بیان کیا جاتا ہے، ان آیات کو نقل نہیں کیا گیا جن میں قسم و جواب قسم مذکور ہے بلکہ صرف ربط کی تفصیل بیان کردی ہے، ان سورتوں کے نام جن میں قسمیہ کلمات مذکور ہیں درج ذیل ہیں:

۱- سورۃ النسا (سورت نمبر ۴ مدنی)	۲- سورۃ الحجر (سورت نمبر ۱۵ مکی)
۳- سورۃ یٰس (سورت نمبر ۳۶ مکی)	۴- سورۃ الصّٰفّٰت (سورت نمبر ۳۷ مکی)
۵- سورۃ صٓ (سورت نمبر ۳۸ مکی)	۶- سورۃ الزخرف (سورت نمبر ۴۳ مکی)
۷- سورۃ قٓ (سورت نمبر ۵۰ مکی)	۸- سورۃ الذاریات (سورت نمبر ۵۱ مکی)
۹- سورۃ الطّور (سورت نمبر ۵۲ مکی)	۱۰- سورۃ النجم (سورت نمبر ۵۳ مکی)
۱۱- سورۃ الواقعہ (سورت نمبر ۵۶ مکی)	۱۲- سورۃ القلم (سورت نمبر ۶۸ مکی)
۱۳- سورۃ الحاقۃ (سورت نمبر ۶۹ مکی)	۱۴- سورۃ المعارج (سورت نمبر ۷۰ مکی)
۱۵- سورۃ المدثر (سورت نمبر ۷۴ مکی)	۱۶- سورۃ القیامۃ (سورت نمبر ۷۵ مکی)
۱۷- سورۃ المرسلات (سورت نمبر ۷۷ مکی)	۱۸- سورۃ النازعات (سورت نمبر ۷۹ مکی)
۱۹- سورۃ التکویر (سورت نمبر ۸۱ مکی)	۲۰- سورۃ الانشقاق (سورت نمبر ۸۴)
۲۱- سورۃ البروج (سورت نمبر ۸۵ مکی)	۲۲- سورۃ الطارق (سورت نمبر ۸۶ مکی)
۲۳- سورۃ الفجر (سورت نمبر ۸۹ مکی)	۲۴- سورۃ البلد (سورت نمبر ۹۰ مکی)
۲۵- سورۃ الشمس (سورت نمبر ۹۱ مکی)	۲۶- سورۃ اللیل (سورت نمبر ۹۲ مکی)
۲۷- سورۃ الضحیٰ (سورت نمبر ۹۳ مکی)	۲۸- سورۃ التین (سورت نمبر ۹۵ مکی)
۲۹- سورۃ العادیات (سورت نمبر ۱۰۰ مکی)	۳۰- سورۃ العصر (سورت نمبر ۱۰۳ مکی)

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی ۳۰ سورتوں میں قسمیں مذکور ہیں، ان میں سے ایک کے سوا باقی مکی سورتیں ہیں اور علامہ طنطاوی کی تحقیق کے مطابق ان قسموں کی تعداد

چالیس ہے، جس کی تفصیل پہلے لکھی جا چکی ہے، ان قسموں میں قسم اور جواب قسم میں ربط کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

۱- سورۃ النساء (مدنی) کی قسم کے متعلق علامہ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں:

اقسم سبحانه بنفسه المقدسة قسماً مؤكداً بالنفي قبله على عدم ايمان الخلق حتى يحكموا رسوله في كل ما شجر بينهم من الاصول والفروع واحكام الشرع واحكام المعاد وسائر الصفات وغيرها، ولم يثبت لهم الايمان بمجرد هذا التحكيم حتى ينتفى عنهم الحرج وهو ضيق الصدر وتنشرح صدورهم لحكمه كل الانشراح له كل الانفساح وتقبله كل القبول - ولم يثبت لهم الايمان بذلك - ايضاً حتى ينضاف اليه مقابلة حكمه بالرضى والتسليم وعدم المنازعة وانتفاء المعارضة والاعتراض -(۲۶)

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم تاکید کے لیے مخلوق کے عدم ایمان پر کھائی ہے جس کی نفی (لا) اس سے پہلے کردی تھی کہ جب تک وہ رسول کریم ﷺ کو ہر مورد نزاع میں حاکم قرار نہ دیں خواہ وہ مورد نزاع اصول ہوں یا فروع، احکام شریعت ہوں یا احکام معاد اور تمام صفات وغیرہ اور ان کا ایمان صرف اس تحکیم سے ثابت نہیں ہوتا جب تک ان سے حرج منتفی نہ ہو اور حرج سینہ کی تنگی ہے اور جب تک ان کے سینے حکم رسول کے لیے مکمل کشادہ نہ ہوں اور جب تک اس کو مکمل طور پر قبول نہیں کرتے اور اس سے بھی ایمان ثابت نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ رسول کے حکم کے آگے تسلیم و رضا عدم مخالفت اور ہر قسم کے اعتراض کا عدم شامل نہ ہو۔

مولانا امین احسن اصلاحی رقم طراز ہیں:

''یہاں فلا و ربک کی قسم کا موقع و محل بھی ملحوظ رہے اس سے صرف رسول کی ظاہری و باطنی اطاعت کی تاکید ہی مقصود نہیں بلکہ یہ منافقین کی جھوٹی قسم کی جو آیت (۶۲) میں مذکور ہے سچی قسم کے ساتھ تردید بھی ہے پھر وربک کے خطاب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی ﷺ کے لیے التفات خاص کی جو دل نوازی ہے اس کی

بلاغتوں کا اندازہ تو صرف اہل ذوق ہی کر سکتے ہیں، قلم ان کی تعبیر سے قاصر ہے''۔

(تدبر قرآن، ج ۲، ص ۱۰۱)

۲- سورۃ الحجر (مکی) آیت ۷۲ میں مذکور قسم کے متعلق مولانا حمید الدین فراہیؒ لکھتے ہیں:

''عرب میں سب سے زیادہ قسم '' لعمری '' (پھر میری جان کی قسم) ہے جس کے یہ معنی کہ میں اپنی بات کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دوں گا، یہیں سے قسم کی اس نوع میں مقسم بہ کے احترام کا پہلو بھی پیدا ہو گیا، کیوں کہ کوئی شخص اس طرح بات کو مؤکد اسی حالت میں کر سکتا ہے جب وہ ایسی چیز کی قسم کھائے جو اس کی نظروں میں محترم اور عزیز ہو، اس نوع کی اقسام کی اصل یہی ہے، پھر یہیں سے '' لعمرك '' (تیری جان کی قسم) وغیرہ اسالیب قسم پیدا ہو گئے جن میں مخاطب کے احترام کا پہلو ہوتا ہے، اس طرح کی قسموں میں متکلم کا منشا گویا یہ ہوتا ہے کہ میں اپنی جان کی نہیں تیری جان کی قسم کھاتا ہوں جو میری نظروں میں سب سے زیادہ عزیز و محترم ہے، چوں کہ عام گفتگو کے لیے یہ اسلوب نہایت دل پسند اور موزوں تھا اس لیے کثرت سے چل گیا اور '' لعمرك، لعمر أبيك و جدك اور بعزتك وغیرہ بہت سے اسلوب رائج ہو گئے، ان میں چند باتیں قابل لحاظ ہیں:

۱- پہلی یہ کہ ان اقسام میں مقسم بہ اگرچہ محترم اور عزیز ہوتا ہے لیکن معبود اور مقدس نہیں ہوتا۔

۲- دوسری یہ کہ جب مقسم بہ مخاطب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مقصود مخاطب کے عزت و احترام کا اظہار ہوتا ہے''۔ (۲۷)

اس قسم کی قسموں کے پس منظر کو جاننے کے بعد سورۃ الحجر کی اس آیت کے بارے میں مفسرین کی آرا ملاحظہ فرمائیں:

ابن قیم لکھتے ہیں:

ان هذا قسم من الله بحياة رسوله ﷺ وهذا من اعظم فضائله ان يقسم الرب عز و جل بحياته ۔

یہ اللہ تعالی کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کی قسم ہے اور یہ بات آپ کے اعظم فضائل میں سے ہے کہ اللہ عز و جل آپ کی حیات کی قسم کھائے۔

ابن عباس فرماتے ہیں:

وما اقسم الله تعالىٰ بحياة نبي غيره ۔ (۲۸)

اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کی حیات پاک کے علاوہ کسی اور نبی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی۔

ابن العربی کہتے ہیں کہ مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہاں نبی رحمت ﷺ کی حیات مبارکہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ (۲۹)

یہ قسم بہ طور شہادت ہے اور اس میں حیات نبیؐ کو بہ طور گواہ پیش کیا گیا ہے، اس نکتہ کی وضاحت اور معتزلہ کے ابطال کے ضمن میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ رائے اہم ہے '' یہاں رسول اسلام ﷺ کی زندگی کی صداقت اور پاکیزگی کو جو کافروں کو بھی مسلم تھی، بہ طور گواہ پیش کیا جا رہا ہے اور یہی مقصد قسم کا ہوتا ہے، اصل قصہ کے درمیان یہ اتنا جز براہ راست رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا اور یہ طریقہ عین خطبات عرب کے موافق ہے''۔ (۳۰)

۳- سورۃ یٰس (مکی) کی قسم والقرآن الحکیم کے متعلق مولانا مودودی نے لکھا ہے، وہ لوگ سخت غلط کار ہیں جو تمہاری نبوت کا انکار کرتے ہیں پھر اسی بات پر قرآن کی قسم کھائی گئی ہے، قرآن کی صفت میں لفظ حکیم استعمال کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے نبی ہونے کا کھلا ثبوت یہ قرآن ہے جو سراسر حکمت سے لبریز ہے، یہ چیز خود شہادت دے رہی ہے کہ جو شخص ایسا حکیمانہ کلام پیش کر رہا ہے وہ یقیناً خدا کا رسول ہے کوئی انسان ایسا کلام تصنیف کر لینے پر قادر نہیں اور محمد ﷺ کو جو لوگ جانتے ہیں وہ ہرگز اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے کہ یہ کلام آپ خود گھڑ گھڑ کر لا رہے ہیں یا کسی اور انسان سے سیکھ کر سنا رہے ہیں۔ (۳۱)

نیز ملاحظہ فرمائیں تدبر قرآن، جلد ۵، ص ۳۹۸۔

۴- سورۃ الصّٰفّٰت (مکی) کی قسموں کے متعلق یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ تینوں انواع کے فرشتے جن کی قسم کھائی گئی ہے ان کے یہ احوال اس پر شاہد اور اس کی واضح دلیل ہیں کہ سب کا معبود اور کارساز ایک ہے جو آسمانوں اور زمین کا اور ساری مخلوق کا مشرق و مغرب کا مالک ہے، فرشتوں کے مذکورہ احوال سے معلوم ہوا کہ ان کی حیثیت بارگاہ الٰہی میں خدام کی ہے اور وہ اللہ کے حکم سے

مختلف فرایض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ (جواہر القرآن جلد ۳، ص ۹۹۲)

اس سے یہ بات نکلی کہ جن لوگوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کو خدائی میں شریک کر رکھا ہے اور ان کی شفاعت کی امید پر ان کی پوجا کر رہے ہیں وہ بالکل حماقت میں مبتلا ہیں، فرشتوں کا خود اپنا طرز عمل ان نادانوں پر ایک کھلی ہوئی نکیر ہے، اس لیے کہ وہ برابر خدا کی بندگی اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں اور یہ احمق لوگ ان کو شریک خدا بنا کر ان کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔ (تدبر قرآن ج ۶، ص ۴۵۳)

۵-سورۂ ص (مکی) کی قسموں کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس قسم کا مقسم علیہ یہاں الفاظ میں مذکور نہیں ہے بلکہ وہ قسم کے اندر مضمر ہے یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں قسم کی نوعیت ایسی ہو کہ مقسم علیہ ذکر کیے بغیر اس سے واضح ہو رہا ہو یہاں یہی صورت ہے، مقصد یہ کہ قرآن جن یاد دہانیوں سے مملو ہے وہ اس بات پر شاہد ہیں کہ آج قریش کو جن باتوں کی تذکیر کی جارہی ہے وہ بالکل ناقابل انکار ہیں، اگر وہ ان کو نہیں مان رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قرآن کے اندر کسی ریب و شک کی گنجایش ہے بلکہ اس کا سبب محض ان کی انانیت اور مخاصمت ہے۔
(تدبر قرآن ج ۵، ص ۵۰۹-۵۱۰)

۶-سورۂ الزخرف کی قسموں کے متعلق ہے کہ قرآن مجید کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف "ہم" ہیں نہ کہ محمد ﷺ اور قسم کھانے کے لیے قرآن کی جس صفت کا انتخاب کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ "کتاب مبین" ہے، اس صفت کے ساتھ قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر خود قرآن کی قسم کھانا آپ سے یہ معنی دے رہا ہے کہ لوگو، یہ کھلی کتاب تمہارے سامنے موجود ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو اس کے صاف صاف غیر مبہم مضامین، اس کی زبان، اس کا ادب، اس کی حق و باطل کے درمیان ایک واضح خط امتیاز کھینچ دینے والی تعلیم یہ ساری چیزیں اس حقیقت کی صریح شہادت دے رہی ہیں کہ اس کا مصنف خداوند عالم کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ (تفہیم القرآن جلد ۴، ص ۵۲۳)

۷-سورۂ ق (مکی) کی قسموں کے بارے میں دیکھیے، قرآن میں اس طرح کی تمام قسمیں بہ طور شہادت ہیں یعنی قسم، مقسم علیہ پر دلیل کی حیثیت سے کھائی جاتی ہے، یہ قسم بھی مقسم علیہ

پر دلیل ہے اگر چہ وہ محذوف ہے، مقسم علیہ ان مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے جہاں کلام کا سیاق وسباق اس کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہو اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ ص میں موجود ہے فرمایا ہے:

ص والقرآن ذی الذکر بل الذین کفروا فی عزۃ و شقاق پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قرآن کی عظمت و جلالت کی قسم ان لوگوں کی تردید میں کھائی گئی ہے جو اس کو شاعری، کہانت یا القائے شیطانی کی قسم کی چیز قرار دیتے تھے، قرآن کی عظمت شہادت میں پیش کر کے ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی ہے جس کا ذریعہ جبرائیل امین ہیں اور جس کا منبع لوح محفوظ ہے۔ (۳۲)

مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"دراصل قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "اہل مکہ نے محمد ﷺ کی رسالت کو ماننے سے کسی معقول بنیاد پر انکار نہیں کیا ہے بلکہ اس سراسر غیر معقول بنیاد پر کیا ہے کہ ان کی اپنی ہی جنس کے ایک بشر اور ان کی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کا خدا کی طرف سے خبردار کرنے والا بن کر آجانا ان کے نزدیک سخت قابل تعجب بات ہے حالاں کہ تعجب کے قابل بات اگر ہوسکتی تھی تو یہ تھی کہ خدا اپنے بندوں کی بھلائی اور برائی سے بے پروا ہو کر انہیں خبردار کرنے کا کوئی انتظام نہ کرتا یا انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے کسی غیر انسان کو بھیجتا یا عربوں کو خبردار کرنے کے لیے کسی چینی کو بھیج دیتا، اس لیے انکار کی یہ بنیاد تو قطعی نامعقول ہے اور ایک صاحب عقل سلیم یقیناً یہ ماننے پر مجبور ہے کہ خدا کی طرف سے بندوں کو خبردار کرنے کا انتظام ضرور ہونا چاہیے اور اسی شکل میں ہونا چاہیے کہ خبردار کرنے والا خود ان ہی لوگوں میں سے کوئی شخص ہو جن کے درمیان وہ بھیجا گیا ہو"، اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ آیا محمد ﷺ ہی وہ شخص ہیں جنہیں خدا نے اس کام کے لیے بھیجا ہے تو اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی اور شہادت کی حاجت نہیں، یہ عظیم و کریم قرآن جسے وہ پیش کر رہے ہیں اس بات کا ثبوت دینے کے لیے کافی ہے۔ (۳۳)

۸-سورۂ الذاریات (مکی) میں جزا و سزا کے وقوع پر چار مظاہر قدرت کی قسمیں ذکر کرنے کی مولانا مودودی نے دو توجیہات بیان کی ہیں، دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "منکرین

آخرت زندگی بعد موت کو جس بنا پر غیر ممکن سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم جب مر کر خاک میں رل مل جائیں گے اور ہمارا ذرہ ذرہ جب زمین میں منتشر ہو جائے گا تو کیسے ممکن ہے کہ یہ سارے منتشر اجزائے جسم پھر اکٹھے ہو جائیں اور ہمیں دوبارہ بنا کر کھڑا کیا جائے، اس شبہ کی غلطی ان چاروں مظاہر کائنات پر غور کرنے سے خود بہ خود رفع ہو جاتی ہے جنہیں آخرت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، سورج کی شعاعیں روئے زمین کے ان تمام ذخایر آب پر اثر انداز ہوتی ہیں جن تک ان کی حرارت پہنچتی ہے اس عمل سے پانی کے بے حد وحساب قطرے اڑ جاتے ہیں اور اپنے مخزن میں باقی نہیں رہتے مگر وہ فنا نہیں ہو جاتے بلکہ بھاپ بن کر ایک ایک قطرہ ہوا میں محفوظ رہتا ہے پھر جب خدا کا حکم ہوتا ہے تو یہی ہوا ان قطروں کی بھاپ سمیٹ لاتی ہے، اس کو کثیف بادلوں کی شکل میں جمع کرتی ہے ان بادلوں کو لے کر روئے زمین کے مختلف حصوں میں پھیل جاتی ہے اور خدا کی طرف سے جو وقت مقرر ہے ٹھیک اسی وقت ایک ایک قطرے کو اسی شکل میں جس میں وہ پہلے تھا زمین پر واپس پہنچا دیتی ہے، یہ منظر جو آئے دن انسانوں کی آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مرے ہوئے انسانوں کے اجزائے جسم بھی اللہ تعالیٰ کے ایک اشارے پر جمع ہو سکتے ہیں اور ان انسانوں کو اسی شکل میں پھر اٹھا کھڑا کیا جا سکتا ہے جس میں وہ پہلے موجود تھے، یہ اجزا خواہ مٹی میں ہوں، پانی میں یا ہوا میں بہر حال رہتے اسی زمین اور اس کے ماحول ہی میں ہیں جو خدا پانی کے بخارات کو ہوا میں منتشر ہو جانے کے بعد پھر اسی ہوا کے ذریعہ سمیٹ لاتا ہے اور انہیں پھر پانی کی شکل میں برسا دیتا ہے اس کے لیے انسانی جسموں کے بکھرے ہوئے اجزا کو ہوا، پانی اور مٹی میں سے سمیٹ لانا اور پھر سابق شکلوں میں جمع کر دینا آخر کیوں مشکل ہو''۔(۳۴)

علامہ آلوسی نے ان تفصیلات کو اس مختصر جملہ میں بیان کیا ہے:

وفی تخصیص المذکورات بالاقسام	اور خصوصی طور پر مذکورہ امور کی قسم کھانے میں
بها رمز الی شهادتها بتحقیق	اشارہ ہے کہ یہ مذکورہ اشیا ان تمام امور کے متحقق
الجملة المقسم علیها من حیث	ہونے پر شاہد ہیں جن پر قسم کھائی گئی ہے اس
انها امور بدیعة فمن قدر علیها	اعتبار سے کہ یہ مذکورہ اشیا عجیب چیزیں ہیں، پس

فهو قادر علی تحقیق البعث	جو ان پر قادر ہے وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی
الموعود ۔(۳۵)	قادر ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

۹-سورۂ طور (مکی) کے سلسلے میں ملاحظہ ہو:

''مجھے ان پانچ عظیم الشان چیزوں کی قسم، مجرمین ومنکرین پر عذاب آکر رہے گا، کسی کی مجال نہیں کہ اس عذاب کو ٹال سکے یا روک سکے''۔

کفار مکہ کو اپنی بہادری، اپنی قوت اور کثرتِ تعداد پر بڑا گھمنڈ تھا، کعبہ شریف کے باعث سارا جزیرۂ عرب ان کا عقیدت مند تھا اور ان کا دل سے احترام کرتا تھا، اس بات نے ان کے نشۂ پندار کو مزید تیز کر دیا تھا وہ دل میں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پہلے تو عذاب آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ مرنے کے بعد کوئی دوبارہ زندہ ہوگا لیکن اگر ایسا ہو بھی گیا اور عذاب آ بھی گیا تو ہم اپنی قوت وشوکت اور اپنے حلیف قبایل کی اعانت سے اسے بآسانی روک لیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خام خیالی کا قلع قمع کر دیا کہ جو خدا طور سے اپنے ایک بندے کو بھیج کر فرعون جیسے فرماں روا کی سرکوبی کر سکتا ہے، جس خدا نے اپنے انبیا ورسل پر جو کتابیں نازل کی ہیں ان سب میں یہ لکھا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال بد کی سزا مل کر رہے گی، جس خدا کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کرنے کے لیے اس کے حضور جبینِ نیاز جھکانے کے لیے فرشتوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، جس نے آسمان کی یہ اونچی اور پایدار چھت بنائی ہے اور وہ خدا جس کے امر کن سے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر معرض وجود میں آگئے ہیں، ظالمو تم کہتے ہو کہ ہم ایسے جبار وقہار کے عذاب کو روک دیں گے ذرا عقل کے ناخن لو تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو جب اس نے تمہیں تباہ کرنے کا ارادہ فرما لیا تو اس کی آتش غضب سے کوئی چیز تمہیں نہیں بچا سکے گی''۔(۳۶)

اس سورہ میں گویا وہی بات واضح فرما دی گئی ہے جو سابق سورہ میں مضمر تھی، اجمال کے بعد تفصیل اور اضمار کے بعد توضیح قرآن مجید کا معروف اسلوب ہے۔(۳۷)

۱۰-سورۃ النجم (مکی) کی قسموں کے متعلق یہ ہے کہ حضور رحمت عالمیان ﷺ نے جب توحید کی دعوت کا آغاز کیا اور اہل مکہ کو کفر وشرک سے باز آنے کی تبلیغ شروع کی تو اہل مکہ نے کہنا شروع کیا کہ آپ گمراہ ہو گئے ہیں، اپنی قوم کا راستہ چھوڑ دیا ہے، آپ کا عقیدہ بگڑ گیا ہے، خالق ارض وسما

نے پہلے قسم کھائی پھر ان کے الزامات کی تردید کی، فرمایا ان کے قول، عمل اور کردار میں گمراہی کا نام و نشان تک نہیں، ان کے عقیدہ میں کوئی غلطی اور کجی نہیں اور صاحبکم فرما کر اپنے حبیب کی کتاب حیات کھول کر ان کے سامنے رکھ دی، یعنی یہ کوئی اجنبی نہیں جو دیار غیر سے آکر یہاں فروکش ہو گئے ہیں اور نبوت کا دھندا شروع کر دیا ہے، تم ان کے ماضی سے، ان کے خاندانی پس منظر سے، ان کے اطوار و احوال سے اور سیرت و کردار سے اچھی طرح واقف ہو، ان کا بچپن تمہارے سامنے گزرا، ان کا عہد شباب اس ماحول میں اور تمہارے اس شہر میں بسر ہوا، انہوں نے تمہارے ساتھ اور تمہارے سامنے کاروبار بھی کیا ہے، سماجی، قومی اور ملکی مسایل میں ان کی فراست کے تم چشم دید گواہ ہو، ان کی کتاب زیست کا کون سا باب ہے جو تم سے پوشیدہ ہے، کون سا ورق ہے جو تم سے مخفی ہے، جب ان کی ساری زندگی شبنم کی طرح پاکیزہ، پھول کی طرح شگفتہ اور آفتاب کی طرح بے داغ ہے تو تمہیں ان پر ضلالت وغوایت کے الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی، (۳۸) مزید تفہیم القرآن ج ۵، ص ۱۹۳ دیکھیے۔

(باقی)

حوالے

(۱) فراہی، حمید الدین، الامعان فی اقسام، مترجم امین احسن اصلاحی، انجمن خدام القرآن لاہور ۱۳۹۵ھ، ص ۲۰ رالبرہان للزرکشی جلد ۳، ص ۴۳ رالاتقان ج ۲، ص ۱۷۰ (۲) ابن قیم، ابوعبداللہ محمد بن ابوبکر، التبیان فی اقسام القرآن، تحقیق فواز احمد زمرلی دارالکتاب العربی بیروت ۱۴۱۵ھ، ص ۴۴ (۳) رازی، امام فخر الدین، مفاتیح الغیب، ج ۲۵، ص ۱۱۸ (۴) ج ۳۱، ص ۹ (۵) التبیان فی اقسام القرآن، ص ۲۳ (۶) ایضاً ص ۴۴ (۷) ایضاً ص ۱۰ (۸) الذاریات: ۲۳ (۹) الحجر: ۷۲ (۱۰) الشمس: ۱۰ (۱۱) التین: ۲ (۱۲) الطباطبائی، سید محمد حسین المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۲۰، ص ۱۴۵-۱۴۶ (۱۳) تفسیر نمونہ، مصباح القرآن ٹرسٹ ۱۴۱۷ھ ج ۱۰، ص ۴۴۴ (۱۴) فتح الرحمٰن بحوالہ جواہر القرآن، ج ۳، ص ۱۰۹۲ (۱۵) تفصیلات کے لیے الامعان فی اقسام القرآن ملاحظہ فرمائیں (۱۶) عثمانی، شبیر احمد، حاشیہ قرآن، مکتبہ رشیدیہ لاہور، ۷۴۹، ۵۷۴ (۱۷) غلام اللہ خاں، مولانا، جواہر القرآن، کتب خانہ رشیدیہ راول پنڈی، ج ۳، ص ۱۰۹۶ (۱۸) دریابادی، عبد الماجد، تفسیر ماجدی، تاج کمپنی لاہور، ج ۱، ص ۵۲۵ (۱۹) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ج ۶، ص ۴۴۹ (۲۰) ایضاً ص ۲۱۰ (۲۱) فاضلی، محمد اشرف، فاضلی فاؤنڈیشن لاہور، ج ۶، ص ۷ (۲۲) ایضاً ص ۶۱ (۲۳) محمد کرم شاہ، پیر، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، ج ۵، ص ۵۵۵-۵۵۶ (۲۴) الشیخ طنطاوی جوہری، الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، مصر ۱۳۵۰ھ، ج ۲۵، ص ۲۶۵ (۲۵) رزاقی، ابوالقاسم، سوگند ھاری قرآن قم، ص ۲۲ یا ۴۲ (۲۶) التبیان فی اقسام القرآن، ص ۳۵۹ (۲۷) الامعان فی اقسام القرآن، ص ۲۴ و ۲۵ (۲۸) التبیان فی اقسام القرآن، ص ۳۵۸ (۲۹) الجامع الاحکام القرآن، ج ۱۰، ص ۳۹ (۳۰) تفسیر ماجدی، ج ۱، ص ۵۲۵ (۳۱) تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۲۲۵ (۳۲) تدبر قرآن، ج ۶، ص ۵۴۴ (۳۳) تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۱۰۹ (۳۴) ایضاً ص ۱۳۴ (۳۵) محمود آلوسی، سید، روح المعانی، تحقیق محمد حسین العرب، دارالفکر بیروت، ۱۹۹۷ء، ج ۱۵، ص ۶ (۳۶) ضیاء القرآن، ج ۴، ص ۶۴۶ (۳۷) تدبر قرآن ج ۸، ص ۲۱ (۳۸) ضیاء القرآن، ج ۵، ص ۱۰

ہندو علما کی قرآنی تصنیفات

از:- ڈاکٹر وزیر حسن

مترجم:- اورنگ زیب اعظمی ☆

یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ غیر مسلم ہندوستانی علما کی ایک کثیر تعداد قرآن مجید کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتی اور اس کی تعلیمات وافکار کو سمجھنے میں دل چسپی لیتی ہے، اس طرح کے لوگوں میں بعض اہل قلم نے اپنی تصنیفات میں قرآن مجید کے حوالے دیے ہیں اور بعض اس کے متعلق غیر جانب داری اور انصاف کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں، اس مضمون میں قرآن مجید سے متعلق ان کی ان تصانیف کا جایزہ لیا جائے گا جو غیر جانب داری سے لکھی گئی ہیں، یہ امر افسوس ناک ہے کہ اس طرح کی کوششوں کی جو قدر ہونی چاہیے تھی وہ نہیں کی گئی، حالاں کہ اس دور میں یہ کام اہمیت سے خالی نہیں، اس سے دونوں قوموں میں مفاہمت کی راہ ہموار ہوگی اور مغایرت ختم ہوگی۔

۱- آر، بی، ہرش چندر Khuda-Qur'anic Philosophy،

مطبع برج اور سینٹر، ریتا پریس نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، صفحات ۷۷۔

مصنف نے اس کتاب کو طویل زمانے کی اپنی محنت کا نتیجہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ محبت الٰہی پر انہوں نے برسوں فلسفیانہ انداز میں غور وفکر کیا ہے، وہ مختلف قرآنی مفاہیم کا خالص فلسفیانہ جایزہ لیتے ہیں، انہوں نے روح کی پیدایش، فطرت خدا، حکمت، علم، وحدت الہ، صفات خداوندی وغیرہ امور پر بحث کی ہے اور ان تمام موضوعات کو اپنی آزاد فکر کی روشنی میں جانچا ہے، انہوں نے اپنی تایید میں متعدد قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے۔

مصنف کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے تعلق سے ہر چیز چاہے ذہنی ہو یا روحانی، خدا ہی سے

☆ گیسٹ لکچرار، سنٹر فار عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-۶۷۔

متعلق ہے، خدا اپنی رحمت سے ارادہ کرتا ہے اور دوسری مخلوقات کو اپنی لامحدود خواہش کے محدود حصہ کے ساتھ پیدا کرتا ہے، مصنف نے کسی جامد یا غیر متحرک خدا کا انکار کیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ خدا ایک فعال ذات ہے، حکمت پر کلام کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ ہر طرح کی حکمت کی ابتدا اپنی ذات کی تعلیم سے اور اس کی انتہا خود اپنی معرفت پر ہوتی ہے، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نظریہ ارتقا کے مراحل کی طرح انسان کی تخلیق کے بھی مختلف مدارج ہیں۔

آر، بی، ہرش چندر کا خیال ہے کہ آدمی اپنی پیدائش کے وقت نہ کائنات کا کوئی حقیقی علم رکھتا ہے اور نہ خود اپنا، البتہ وہ علم حاصل کرنے کی اہلیت ضرور رکھتا ہے اور یہی وہ آخری چیز ہے جو احساسات کے ذریعہ آتی ہے، چنانچہ اس علم کی بہ دولت ایک آدمی خدا کے قوانین کو جان سکتا ہے اور ان پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہوسکتا ہے، روح سے متعلق ان کی رائے ہے کہ ارواح کو وجود میں ایک کامل شے یا مستقل وحدت کے طور پر نہیں لایا جاتا بلکہ ہر ایک وجود کی اپنی ایک تاریخ اور میراث ہے، ہر روح کو خدا کا ہدیہ، اختیار و آزادی چند حدود و قیود کے ساتھ حاصل ہوتا ہے، چنانچہ ہوش و ارادہ کی صورت میں ایک آدمی اپنے برتاؤ کا ذمہ دار ہوتا ہے، جسم کے بہ جائے روح موت کا مزہ چکھتی ہے، موت کا مطلب ہے حرکت، شعور، عمل، خواہش کا رک جانا، ان کی یہ رائے دل چسپ ہے کہ سورج زندگی کا فوری طور پر ذریعہ ہے، زمانے تک اس میں روح سو رہی تھی یہاں تک کہ زمین اس سے الگ ہوئی اور ضروری حد تک ٹھنڈی ہوئی، پانی کا وجود ہوا اور زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

وحدت اللہ کے متعلق ہرش چندر کا خیال قرآنی تصور توحید سے بہت مختلف ہے، ''رب العالمین'' کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ''عالم'' کا مطلب ہے وہ جو معلوم و معروف ہو، ''عالمین'' جمع ہے، یہ صرف ستاروں اور بادلوں کی دنیا کے بارے میں اشارہ نہیں ہے بلکہ دماغ کی دنیا خود ایک الگ اکائی ہے، درحقیقت ہر وہ شے جسے انسان کا دماغ پہچانتا ہے وہ ایک دنیا یا کائنات ہے، ''رب'' کا معنی ''بنیادی اصول'' ہے اس طرح پوری کائنات اور اس کا ہر حصہ اپنا ایک اساسی مادہ رکھتا ہے جو اس کے ساتھ اس کی مدت بقا تک رہتا ہے۔

آدمی کو اختیار و تصرف کی نعمت بخشی گئی ہے اس لیے وہ موجودات کائنات کا آزادانہ انتظام و انصرام کرتا ہے، اسے خدا کو ماننے نہ ماننے کا اختیار بھی دیا گیا ہے اما شاکرا و اما کفورا،

فرشتوں اور شیطانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، شیاطین کھلے طور پر نافرمان ہیں اور فرشتے طاعت و عبادت پر مامور ہیں۔

وہ اس کی تردید کرتے ہیں قرآن مجید کا نظام جابرانہ اور نامناسب ہے، ان کے خیال میں قرآن ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے مناسب ہے، امیر و غریب، وضیع و شریف، فرد و قوم سب کے لیے وہ موزوں ہے، جن لوگوں کا خیال اس سے مختلف ہے وہ قرآن کے فلسفہ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، قرآنی فلسفہ پوری طرح سے منطقی ہے، اس کے اصول اخلاق اس محکم اصول پر مبنی ہیں کہ ہر وہ چیز جو انسان کے لیے مضر ہو غیر اخلاقی ہے، قرآنی فلسفہ کو ماننے والا اس کا دعوی نہیں کرتا کہ یہ فلسفہ اسی کے عقیدہ و نظریہ کے مطابق ہے۔

مصنف نے کتاب کا خاتمہ خدا کی صفات پر دلالت کرنے والے قرآنی اقتباسات پر کیا ہے تاکہ حقیقت کی بدیہی تصویر سامنے آجائے، قرآنی آیات کے حوالے انہوں نے ان کے نمبروں اور سورتوں کے تذکرے کے بغیر ہی دیے ہیں، اس سے آیتوں کو تلاش کرنے میں دشواری ہوتی ہے، مصنف نے انگریزی ترجمہ قرآن کے لیے پامر اور سیلز سے استفادہ کیا ہے۔

الغرض یہ کہ قرآن کے متعلق ایک آزادانہ رائے ہے، مصنف کا مطالعہ غور و تعمق اور صحیح فکر سے خالی ہے، وہ ویدک افکار سے متاثر ہیں جن کو قرآن مجید میں بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے باوجود وہ اس کے بہت سے افکار سے متاثر بھی ہیں، اپنی کتاب کے آخر میں جن آیتوں کو بغیر نقد و تحلیل کے نقل کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان سے کلی طور پر متفق ہیں۔

۲- پنڈت سندر لال: The Gita and The Qur'an

انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچر اسٹڈیز، حیدر آباد ۱۹۵۷ء، کل صفحات ۱۴۶۔

یہ پنڈت سندر لال کی ہندی زبان میں ایک تصنیف ہے جسے سید اسد اللہ نے انگریزی کا جامہ پہنایا، اس میں مصنف نے قرآن و گیتا کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا ہے، انہوں اس کی بھی کوشش کی ہے کہ دونوں کتابیں کس حد تک اپنی بنیادی تعلیمات میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں، یہ صحیح معنوں میں دو مختلف ثقافتی اکائیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو پروان چڑھانے کی ایک اچھی اور مفید کوشش ہے۔

انگریزی ترجمہ کا مقصد افادہ عام اور ایک وسیع حلقے کو دونوں مقدس کتابوں کی مشترک و مشابہ تعلیمات سے واقف کرانا ہے، اس کے سات ابواب میں مصنف نے بڑی کامیابی سے دونوں کتابوں کا تعارف، ان کا مذہبی تصور اور خلاصہ پیش کیا ہے۔

پنڈت سندر لال پرزور انداز میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر ایک ہیں، ان کے مابین نزاع کو ختم کرنے والی چیز دھرم ہے، جس کے ثبوت کے لیے انہوں نے گیتا، قرآن اور احادیث نبویہ کے حوالے دیے ہیں، وہ مذہب کی اسی اصل شکل کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو صحیح راہ کی طرف رہنمائی کر سکے، ان کا خیال ہے کہ انسان کو صحیح راہ پر قایم رکھنے کے لیے دنیا کے تمام مذاہب نے ایک اعلا و برتر خدا پر یقین کو لازم گردانا ہے، ان کے نزدیک مذہب ہی انسانوں کو جوڑ اور ان کے دلوں کو باندھ سکتا ہے، حمد باری کا ذکر تمام اہم مذاہب کی کتابوں میں ہے، انہوں نے قرآن اور رگوید اسے متشابہ المعانی الفاظ کا ایک انتخاب پیش کیا ہے۔

پنڈت جی نے ان حالات کا ذکر کیا ہے جن میں یہ کتاب پیش کی گئی، انہوں نے قرآن و گیتا میں پیش کیے گئے اصولوں کی وضاحت دونوں کتابوں اور دونوں مذاہب کے معتمد علما کی تحریروں کی روشنی میں کیا ہے، دونوں مذاہب میں بنیادی مشابہت کو دکھانے کے لیے صوفیوں، سادھوؤں اور بھکتوں کی تحریریں بھی پیش کی ہیں اور ایشور کا مفہوم، خدائی صفات، بعث بعد الموت، انبیا، خدمت خلق، نہی عن الشہوات، معرفت نفس، یوگا اور سلوک وغیرہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔

مصنف نے عظیم روحانی ہستیوں کی تحریروں کو نقل کر کے بتایا ہے کہ ان حضرات نے معاشرے کو پاکیزہ اور خوش گوار بنانے اور برائیوں کے انسداد کے لیے کیا جدوجہد کی ہے، پنڈت جی نے کبیر، داؤد، گرونانک اور گروگوند کے علاوہ ویدوں، بائبل، چینی عالم کونگ فیوژ اور بدھ کے اقتباسات و تحریروں کو بھی پیش کیا ہے۔

پنڈت سندر لال نے بہ تفصیل بتایا ہے کہ گیتا ہندو مذہب کی اہم کتاب ہے جو تقریباً دنیا کا سب سے قدیم مذہب ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ موجودہ آسمانی صحایف میں رگوید اسب سے قدیم اور زیادہ اہم ہے، اپنشد کو وید کا خاتم اور خلاصہ بتایا جاتا ہے اسی لیے اسے ویدانت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنشد عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہے، صرف علما ہی اسے سمجھ سکتے

ہیں، اپنشد کے بعد ہندوؤں کے نزدیک زیادہ مشہور کتاب سروبھگوت گیتا ہے، یہ دنیا کے اہم اور دایم الذکر صحایف میں سے ہے۔

انسانی تاریخ ہمیشہ سے اختلافات و نزاعات سے بھری رہی ہے، مذہب اس نزاع کے خاتمے اور اصول اخلاق قایم کرنے کے لیے آتا ہے جہاں تک گیتا کا تعلق ہے ناقدین کو اس کے دوام پر شبہ ہے، ہاں یہ مان لیا گیا ہے کہ جنگ کی پوری تصویر ایک رزمیہ ہے جو آدمی کے ذہن میں نیکی اور بدی کے درمیان دایمی نزاع کی تصویر کشی کرتی ہے۔

"مذہب گیتا" کے عنوان کے تحت پنڈت سندر لال نے باب در باب بحث کی ہے، پہلا باب کورو کے جنگ نے کرنے پر ارجن کا دفاع ہے، دوسرا باب شری کرشن کے جواب پر مشتمل ہے، جنہوں نے ارجن کے خوف کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، پھر شری کرشن تفصیل سے حیات کا فلسفہ پیش کرتے ہیں، ارجن کے ذہن میں دوبارہ ایک اور سوال آتا ہے، وہ خود سے کہتے ہیں کہ کیوں نہ وہ دنیا کو تیاگ دے دیں، جب انھیں نجات حاصل کرنے کے لیے نفس کشی کرنی ہے، اس سوال کے جواب میں، تیسرے باب میں ایک تشریح مذکور ہے، چوتھے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب لوگ صحیح عقیدہ کو بھول جاتے ہیں اور غلط عقیدہ کو صحیح مان لیتے ہیں تب گراں قدر ہستیاں وجود پذیر ہوتی ہیں جو ایک مرتبہ پھر صحیح عقیدہ کی راہ دکھاتی ہیں، پانچویں باب میں ارجن نے وہی سوال دہرایا ہے، انہوں نے پوچھا ہے کہ ان راہوں میں کون بہتر ہے، سادھو سنت کی راہ جو ہدایت پانے کے لیے اپنی عقل پر بھروسہ کرتے ہیں یا وہ جو دنیاوی فرایض انجام دیتا ہے اور اپنی روح کی فلاح کے لیے مجاہدہ کرتا ہے، مذکورہ بالا سوال کے جواب میں گیتا کا بیان ہے کہ دونوں راہیں بنیادی طور پر ایک جیسی نہیں ہیں، اس لیے وہ ان میں تطبیق کی کوشش کرتی ہے، چھٹے باب میں دوبارہ سنکھیا اور کرما کو ایک دکھایا گیا ہے، وہ لوگ جو پرمیشور کو جاننا چاہتے ہیں، ان کے لیے ساتویں باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر چیز میں موجود ہے، اس کے باوصف پرمیشور اور انصاف آلہہ کے درمیان فرق کو بھی واضح کیا گیا ہے، اس باب میں ایک خدا، پرمیشور یا اللہ کی عبادت پر زور دیا گیا ہے، آٹھواں باب ان دلایل پر مشتمل ہے کہ پرمیشور ہی اس کا اہل ہے کہ اس کی عبادت ہو، نویں باب کے شروع میں کہا گیا ہے کہ کسی سے بغض نہ رکھنا ہی اصل حقیقت

ہے، اس کو پالینے والے وہی ہیں جو اپنی زندگی میں دھرم کو باقی رکھے ہوئے ہیں، دسویں اور گیارہویں باب میں پرمیشور کے بارے میں یہ مبنی بر حقیقت خیال پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس سے قبل ہر چیز غیر حقیقی ہے، وہ آدمی کے حدود سے پرے ہے، ثنویت اور انشقاقیت سے دور ہے، انسانی خیال سے بالاتر ہے، تمام کاینات کو شامل ہے، اسے اس کے ان لامحدود مظاہر کے ذریعہ ہی جانا جاسکتا ہے جو ہر جگہ ہیں، بارہویں باب کا عنوان '' بھکتی یوگا'' ہے جس میں ارجن نے ایک بار پھر یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا وہ مخلص بندہ نہیں ہے جو پرمیشور کی ان صفات کو پوجا کرتا ہے جو مختلف آلہہ کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہیں، گیتا کا جواب اس باب کا موضوع ہے، گیتا کا تیرہواں باب اپنی گفتگو میں فلسفیانہ نہیں ہے، ویدانتا سوترا (برہماسوترا) کا نام صرف گیتا میں ایک مرتبہ آیا ہے، اس باب میں اس کی حقیقت کو بتایا گیا ہے، چودھویں باب میں تین صفات کی وضاحت کی گئی ہے، ''شوا'' (امن)، ''راجاس'' (حرکت) اور ''تماس'' (سستی)، پندرہویں باب میں دنیا کا موازنہ پیپل کے درخت سے کیا گیا ہے، سولہواں باب انسان کو دو مختلف صفات میں بانٹ دیتا ہے، ۱-دیوی سمیت (خدائی) اور ۲-انسوری سمیت (شیطانی)، اول الذکر روح کو آزاد کرتا ہے جب کہ موخر الذکر اسے قید کرتا ہے، سترہویں باب میں ارجن دوبارہ یہ سوال کرتے ہیں، تمہاری ان لوگوں کے بارے میں کیا رائے ہے جو خدا کے سامنے قربانی اپنے ذاتی ایمان کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں اور اس باب میں اس کی کتاب وہدایت سے رہنمائی نہیں حاصل کرتے، شری کرشنا کا جواب اس باب کا موضوع ہے، اس جز کے اٹھارہویں اور آخری باب میں رسوم کے مشاہدے کا ظاہری پہلو دکھایا گیا ہے۔

اس جز کا آخری حصہ گیتا کے مغز کی ایک مختصر توضیح پیش کرتا ہے۔

کتاب کے دوسرے جز میں پنڈت سندر لال نے قرآن کا مطالعہ اس طرح پیش کیا ہے جس طرح گیتا کا اس کی ابتدا قرآن کے مختصر تعارف سے ہوتی ہے۔

پنڈت سندر لال کا کہنا ہے کہ قرآن کا لغوی معنی ہے ''اعلان کیا گیا'' یا ''پڑھا گیا''، واقعہ یہ ہے کہ قرآن اپنے سے پہلے نازل شدہ صحایف کو ''قرآن'' کا نام دیتا ہے، نبی ﷺ کے اقوال و آرا کو ''حدیث'' کہا جاتا ہے، قرآن کا اسلوب جیسا کہ عرب اور غیر عرب علما مانتے ہیں، انتہائی اعلا، پرلحن اور شیریں ہے مگر تلاوت کا انداز وید از کی طرح مختلف ہے۔

مصنف نے قرآن کے زمانہ نزول کے حالات کا ایک سرسری مطالعہ بھی پیش کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ بہت سی برائیاں بالخصوص سود سرزمین عرب میں عام تھا، قرآن نے اس طرح کے مضر اور زہرناک عادات مثلاً شراب نوشی، جوابازی، رشوت اور بچیوں کا زندہ دفن کرنا وغیرہ کو ختم کیا۔

'' قرآن اور اس کی تعلیم '' کا عنوان مصنف نے قرآن کی ابتدائی آیات سے شروع کیا ہے، اس میں اسلام کے بنیادی اصول بتائے ہیں اور اس کے لیے قرآنی آیات کو مختلف عناوین کے تحت ذکر فرمائی ہیں جیسے حمد باری تعالی، تمام لوگ ایک معاشرہ، توحید الٰہی کا پیغام ہر ایک کو دیا گیا، لا اکراہ فی الدین، خدا ہر ایک کو شامل ہے، محمد ﷺ اور معجزات، صدقات لینے کی اجازت، اشاعت عقیدہ، خیرات، شر کا بدلہ خیر سے، مسایل نسواں، جہاد، آخرت اور دیگر قرآنی آیات، کتاب کا خاتمہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے مختصر تعارف پر ہوتا ہے۔

پنڈت سندر لال کا یہ کام نہ صرف گیتا و قرآن کے موازنہ کے سبب اہمیت کا حامل ہے بلکہ اس نے ہندوؤں کے ذہن سے قرآنی تعلیمات کے بارے میں غلط فہمیاں دور کردی ہیں جیسے اکراہ فی الدین اور قتل ہندو کی اجازت عام وغیرہ، اس میں جہاد کا اصل مفہوم بھی پیش کیا گیا ہے۔

۳-موکندن: Congrueacies of Fundamentals in the Qur'an and Bhagwat Gita، سمکلین پراکاشن، نیودہلی ۱۹۹۰ء، کل صفحات ۴۲۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے اس لیے لکھی گئی ہے تاکہ قرآن اور گیتا کی مشترک بنیادی تعلیمات کو واضح کیا جائے، اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دونوں مذہبی کتابوں کا منشا یہ ہے کہ دنیا میں نیک اور صالح لوگ باقی رہیں اور فاسق و فاجر لوگ ہلاک و برباد ہوجائیں تاکہ معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جائے، ان کتابوں میں مذاہب کے بنیادی اصول ایک دوسرے سے کافی ملتے جلتے ہیں۔

توحید الہ، مفہوم روح، طریق نجات، تخلیق، موت، آخرت، یوم حساب وغیرہ ایسے اہم موضوعات جو کسی نہ کسی پہلو سے دونوں کتابوں میں مشترک ہیں، مثال کے طور پر اعلا و برتر قابل عبادت معبود پر زور دیتے ہوئے لارڈ کرشن گیتا میں اعلان کرتا ہے ''وہ تمام مذاہب کو دور کر کے

صرف ایک خدا کی پناہ چاہتا ہے" اور قرآن بھی کہتا ہے "الحکم الہ واحد لا الہ الا ھو"۔

مصنف عصر حاضر کے حالات و مسایل سے اچھی طرح واقف ہیں اور غالباً حالات کی واقفیت ہی نے انہیں یہ اہم اور قابل قدر کام انجام دینے پر آمادہ کیا ہوگا، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس طرح کے کاموں کی قدر و قیمت مسلم ہے۔

۴- ونوبا بھاوے: The Essence of Qur'an

اکھل بھارت سیوا سنگھ ۱۹۶۲ء، کل صفحات ۲۵۵۔

اچاریہ ونوبا بھاوے نے پچیس سال تک قرآن کا مطالعہ کیا اور پھر ایک کتاب The Essence of Qur'an لکھنے کا فیصلہ کیا، آیات کا انتخاب انہوں نے اصل عربی متن سے کیا ہے، انگریزی ترجمہ محمد مارماڈیوک پکتھال سے ماخوذ ہے، ونوبا بھاوے نے ان آیات کو مناسب عناوین میں تقسیم کر کے قرآن کے پیغام کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اصلاً انہوں نے عناوین اپنی مادری زبان مراٹھی میں قایم کیے تھے جسے کسی دوسرے شخص نے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے، اس تصنیف کا مقصد جیسا کہ ونوبا جی نے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے، لوگوں کے دلوں کو جوڑنا ہے۔

کتاب کے کل نو حصے ہیں، ہر حصہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہے، پہلا حصہ قرآن کی ابتدائی آیات سے شروع ہوتا ہے پھر قرآن کا تعارف خود قرآنی آیات کی روشنی میں کرایا گیا ہے، دوسرا حصہ خدا سے متعلق ہے، یہ قرآنی تصور توحید و شرک پر دلالت کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ خدا کی اس فطرت کا بھی تذکرہ ہے کہ وہ روشنی ہے، اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے اور وہ رحمت والا ہے، خدائی انعامات، تخلیق کائنات، حسن تخلیق الٰہی اور آیات الٰہی وغیرہ کا بیان بھی آیا ہے، خدا کی ایک اور صفت قدرت کاملہ کا بھی ذکر ہے یعنی وہ طاقت ور، بالاتر ارادہ کا حامل اور نہایت عظیم ہے، ونوبا جی نے ذکر الٰہی، وحی اور عبادت سے متعلق آیات بھی جمع کی ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ قربانی پر مشتمل ہے اس حصہ میں گریہ وزاری، تمام مخلوق پر رحم، خدا کی عبادت و ایمان راسخ، قربانی، اخلاص، امتحان، صبر وغیرہ موضوعات زیر بحث آئے ہیں، اس کے علاوہ صحبت اولیا، ظاہری وجود کا زوال و خاتمہ اور اطمینان و سکون ہے۔

چوتھا حصہ مختلف عناوین کے تحت قرآن کی روشنی میں عابد و کافر کی پہچان اور خصوصیات

کو واضح کرتا ہے، پانچواں حصہ مذہبی امور کے لیے خاص ہے، اس میں مذہبی اصول و مبادی، مذہبی رواداری اور مذہبی رسوم و رواج سے متعلق آیات کو جگہ ملی ہے، چھٹا حصہ اخلاقی اصول پر دلالت کرتا ہے، یہ حق و باطل کے درمیان تمیز، قول حق و حسن اور نرم گفتگو، عدم افترا، انصاف، عقیدہ عدم العنف، وحدت اور عدم تعاون مع الاشرار کے اصول و مبادی کو شامل ہے، کھانے پینے میں احتیاط، عفت، ایمان داری، طریق زندگی، خیرات، اخلاقی تعلیمات، اخلاقی مشورہ اور اچھا برتاؤ وغیرہ ونوبا بھاوے کی دل چسپی کے موضوع ہیں، چنانچہ ان سے متعلق آیات کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، انسان اور اس کی طبیعت و خصوصیت کو ونوبا بھاوے نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ساتواں حصہ اسی پر مشتمل ہے۔

آٹھواں حصہ انبیا پر ہے، اس میں انبیا کی عام صفات بالخصوص حضرات نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا تذکرہ ہے اور محمد سے متعلق قدرے تفصیلی بیان شامل ہے۔

نواں اور آخری حصہ اسرار و رموز پر ہے، اس میں مختلف موضوعات شامل ہیں جیسے فلسفۂ عالم، حرمت روح، سبب و مسببات، عدم انقطاع عمل بعد از موت وغیرہ۔

ونوبا بھاوے جی نے منقولہ قرآنی آیات کی اپنی طرف سے کوئی توضیح نہیں کی ہے تاہم انہوں نے قرآن مجید کے فکر و زاویہ نظر کو واضح کرنے والی مفید و موثر قرآنی آیتیں درج کی ہیں جن کا علم ہر ایک کے لیے ضروری ہے، قرآنی تعلیم و ہدایت کا یہ مرقع اس لیے تیار کیا گیا ہے تاکہ محبت، اخوت اور امن و سلامتی کا وہ پیام عام ہو جو خود ہمارے ملک و قوم کے مفاد میں بھی ہے۔

۵- او، پی، گھائے: Selections from The Qur'an

انسٹی ٹیوٹ آف پرسنل ڈیولپمنٹ، اسٹرلنگ پبلیکیشن، نیو دہلی-۱۹۹۲ء۔

اس کتاب کی ابتدا پروفیسر رشید الدین خاں کے مقدمہ سے ہوتی ہے، انہوں نے فلسفیانہ افکار و مسایل کی اہمیت اور کتاب کے مندرجات کی نوعیت بیان کرکے اس کے مطالعہ پر زور دیا ہے، پروفیسر خاں نے لایق مصنف کی لیاقت و قابلیت کی ستایش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مفید اور لایق مطالعہ کتاب ان کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے، مقدمہ نگار نے ابتدائی دور کے

مسلمانوں کی سائنسی اور ہیومنیٹیر خدمات کا اجمالی تعارف کرایا ہے اور علم کی اہمیت اور آزادی، مساوات اور عدل وانصاف سے متعلق اس کی تعلیمات وہدایات بھی پیش کی ہیں۔

یہ مقدمہ اس امید پر ختم ہوا ہے کہ او، پی، گھائے کا یہ کام قرآن مجید اور اس کے تصور وحدت کو سمجھنے میں معاون ہوگا، مقدمہ کے معاً بعد پروفیسر ایس، اے، علی، ڈائریکٹر، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، دہلی کا یہ نوٹ دیا گیا ہے، ”بالعموم انتخاب آدمی کے ذاتی رجحان کے آئینہ دار ہوتے ہیں مگر جناب گھائے نے اتنے بہتر انداز سے یہ کام انجام دیا ہے کہ جانب داری اور غیر جانب داری کے درمیان کی حد فاصل پوری طرح سے نہاں ہے“۔

فاضل مصنف نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ طالب علمی کے زمانے ۱۹۳۰ء ہی سے مجھے مذہبی لٹریچر پڑھنے سے دل چسپی تھی، ۱۹۴۰ء میں مجھے میرے ایک دوست نے مولانا محمد علی کی کتاب Selection from The Holy Qur'an دی، اس سے مجھے پورے قرآن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اسی دوران مختلف مذاہب کی بہت سی کتابیں بھی پڑھیں اور پھر مذہب پر لکھنا شروع کیا، میری پہلی کتاب کا نام Unity in Diversity ہے، یہ دراصل دنیا کے مختلف بڑے مذاہب کے اخلاقی اصولوں کی ایک کنجی ہے، یہ تیرہ ہندوستانی اور غیر ہندوستانی زبانوں میں چھپ چکی ہے اور بارہ مزید زبانوں میں چھپ رہی ہے جن میں سے ایک بریلی ہے، اس سے میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے مذہبی کتابوں کے مشترک اور مفاہمتی پروجیکٹ پر کام کرنا شروع کیا جس کے نتیجہ میں بھگوت گیتا، دی جاپجی اور سلیکشنز فرام دی قرآن سامنے آئیں۔

اصل کتاب کا آغاز آنحضرت کی مختصر سیرت طیبہ اور آپ پر نازل ہونے والی وحی سے ہوتا ہے۔

مصنف نے ایک جدول بھی دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب نزولی کیا تھی، اگر اس بارے میں علما کے اختلافات ہیں تو ان کی صراحت بھی کردی ہے، مصنف اسلام اور اس کے مبادی کو پیش کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ”قرآن مجید اور سیرت محمدی نے کروڑوں لوگوں کی زندگیوں پر جو اثر ڈالا ہے وہ آیندہ بھی ہوگا“، انہوں نے اسلام کے مندرجہ ذیل پانچ ارکان کا ذکر کرکے بتایا ہے کہ ان کی پابندی اور اتباع ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے:

۱- ایمان باللہ   جس میں ایمان بالرسالت بھی شامل ہے۔

۲- پنج وقتہ باوضو نماز   جس میں سورہ فاتحہ اور قرآن کی کچھ مزید آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔

۳- زکوۃ   یعنی اپنے مال کے ایک خاص حصہ کو اس کے مقررہ نصاب کے مطابق مستحقین کے لیے نکالنا، اسی طرح والدین، یتیموں، پڑوسیوں اور اجنبیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنا۔

۴- رمضان کا روزہ رکھنا   یعنی صبح سے شام تک بھوکے پیاسے اور جنسی خواہشات سے رکے رہنا، پہلی وحی رمضان ہی میں نازل ہوئی تھی۔

۵- حج ادا کرنا   یعنی زندگی بھر میں اگر وسعت ہو تو خانہ کعبہ کی ایک مرتبہ زیارت کرنا۔

اسلام میں ”شراب یا دیگر مسکر اشیا کا استعمال اور بتوں کی پوجا حرام ہے“، قرآن مجید دیگر مذاہب کی طرح ارواح کے نامعلوم عالم کا اعتراف کرتا ہے اور اللہ کے وجود وعظمت کو مانتا ہے اور اس کے ارادے کے مطابق انسان کو ہر وقت تیار رہنے کی تاکید کرتا ہے“۔

مصنف نے پورے قرآن مجید سے آیات کا جو حسین انتخاب پیش کیا ہے، اس کی نوعیت یہ ہے:

سورۃ الفاتحہ جو خلاصۂ قرآن ہے اس کو مکمل شامل کیا ہے اور دیگر سورتوں سے اہم اور منتخب آیات لی گئی ہیں، یہ آیات روزمرہ زندگی اور عام فلسفۂ دین سے متعلق ہیں مثلاً اللہ کا وجود، اس کی وحدت، اس کی صفات، عدل، امن، محبت، انصاف اور اخوت وغیرہ۔

کتاب کے آخر میں مشہور ہندوستانی فاضل اصغر علی کے قلم سے ”Afterward“ نام کا ایک خلاصہ ہے جس میں انہوں نے جدید ہندوستان میں بڑھتی ہوئی مذہبی گروہ بندی اور اسلام دشمنی، ظلم وتشدد اور عصبیت پر افسوس ظاہر کیا ہے اور اسے ایک مخصوص سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے، ان کے خیال میں اسلام دوسرے مذاہب کی طرح محبت، انصاف اور امن کو فروغ دیتا ہے، ان آیتوں کی تعداد بہت کم ہے جن میں کفار مکہ اور ان کے مددگار یہودیوں اور عیسائیوں سے بدلہ لینے وغیرہ کا ذکر ہے اور ان کا بھی ایک خاص تاریخی پس منظر ہے، اس پس منظر کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔

اصغر علی صاحب لکھتے ہیں کہ عصبیت اور گروہ بندی کے اس دور میں جناب گھائے کی

کتاب کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، اس سے قرآن مجید کے پر امن اور عصبیت سے خالی نظریے کو سمجھنے میں مدد ملے گی، اسے لکھ کر انہوں نے وقت کی اہم ضرورت پوری کی اور مفید علمی خدمت انجام دی ہے۔

۶- باندی سری نواس راؤ: Christ in The Qur'an and Bible

باندی برادرس، گوداوری، ۱۹۷۵ء۔

مصنف کے بیان کے مطابق اس کتاب سے ان کا مقصد ناواقف لوگوں کو قرآن مجید اور بائبل کے درمیان گہرے تعلق سے واقف کرانا اور یہ بتانا ہے کہ بائبل جیسی آسمانی کتاب کی موجودگی کے باوجود محمد ﷺ پر قرآن مجید کیوں نازل ہوا؟۔

مصنف نے قرآنی تصور توحید بیان کرنے کے بعد بائبل اور دیگر صحف کی روشنی میں عقیدۂ تثلیث کی وضاحت کی ہے، قرآن تورات کو موسیٰ پر نازل صحیفہ گردانتا ہے، اسی طرح انجیل بھی حضرت مسیح پر نازل ہوئی جن کو ''کلمۃ اللہ'' کے لقب سے نوازا گیا، قرآن مجید کی تاکید ہے کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ کی قدر و عزت نہیں کریں گے، قیامت کے دن خدا ان سے مواخذہ کرے گا۔

باندی سری واستو راؤ کے نزدیک اسلام کے بہت سے تصورات عیسائی فکر و عقیدہ سے ملتے جلتے ہیں، قرآن بھی ایک منزل من اللہ کتاب ہے، اس کی بے شمار آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ بائبل نافذ العمل ہے چاہے وہ خدا کے کلمات ہوں یا وہ کسی اور کی زبانی منقول ہوں، اسی طرح انہوں نے قرآنی آیات کو تورات، زبور اور دوسرے صحف سماوی کے نافذ العمل ہونے کے ثبوت میں بھی پیش کیا ہے، قدیم آسمانی کتب کی موجودگی میں محمد ﷺ پر قرآن نازل کیے جانے کا سبب بیان کرتے ہوئے انہوں نے بے شمار قرآنی آیات نقل کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن کا نزول صرف اس لیے ہوا ہے کہ وہ قدیم آسمانی کتب کو صحیح اور نافذ العمل ثابت کرے۔

مصنف کے خیال میں انسان کو تمیز کی صلاحیت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ صحیح اور غلط میں امتیاز کر سکے اور غلط کاموں کا خود ذمہ دار بنے، خدا ہر چیز سے واقف ہے، ملائکہ بھی انسان کے ساتھ پیش آنے والی بہت سی باتوں سے آگاہ ہیں، چنانچہ تخلیق آدم سے قبل انہوں نے انسان کی گمراہی وضلالت کی پیشین گوئی کی تھی، خداوند قدوس انسان کے گناہ کا ذمہ دار نہیں۔

کتاب کا ایک معتد بہ حصہ حضرت عیسیٰ کے تعارف پر مشتمل ہے اور یہ کہ وہ دوبارہ مبعوث ہوں گے، مصنف نے کتاب کا خاتمہ قرآنی سورتوں کی ایک فہرست پر کیا ہے۔

اس کتاب کا اصل مقصد عیسائیت کو قرآن کی روشنی میں صحیح مذہب ثابت کرنا ہے مگر اس بحث نے آگے بڑھ کر بہت سے قرآنی افکار کا احاطہ کر لیا، قرآن سے متعلق مصنف کا علم و واقفیت قابل تعریف ہے۔

۷- سی، ای، مودی راج: قرآن شریف کی عظمت

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدر آباد، کل صفحات ۲۰۔

اردو زبان میں لکھی گئی یہ کتاب ان قرآنی آیات کا مجموعہ ہے جو مصنف کی دل چسپی کے موضوعات سے متعلق ہیں، اس کے مصنف سی ای مودی راج جنوبی ہند کے ایک ریٹائرڈ انجینئر ہیں۔

کتاب کے مقدمہ میں جناب مودی راج نے قرآن مجید سے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا ماحصل یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس کی عظمت سے ناواقف ہے کیوں کہ اس کو ٹھیک سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جب کہ زندگی کا ہر شعبہ اور دنیا کا ہر گوشہ اس کی روشنی سے منور ہے، قرآن مجید جا بجا عقل کے استعمال پر زور دیتا، لوگوں کو آزادانہ فیصلہ کرنے کا حکم دیتا اور غور و فکر کی تلقین کرتا ہے، اس کی تعلیمات عالم گیر ہیں اور وہ کسی خاص گروہ اور مخصوص قوم کے لیے نہیں ہیں۔

کتاب کا آغاز ''حمد'' کے عنوان سے خدا سے متعلقہ آیات سے کیا گیا ہے پھر توحید الٰہ صفات باری تعالیٰ، قوت ربانیہ اور دیگر امور قرآن کی روشنی میں زیر بحث آئے ہیں۔

دوسرا حصہ ''قانون، قرآن کی روشنی میں'' کے عنوان پر مشتمل ہے، اس میں تین ذیلی عناوین ہیں: ۱- قوانین جنود، ۲- احکام عامہ اور ۳- رفاہی قوانین۔

ہر عنوان کے تحت اس سے متعلق قرآنی آیات مذکور ہیں جو اس کی بنیادی چیزوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔

کتاب، جیسا کہ اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے، قرآن مجید کی عظمت کو واضح کرنے کے لیے لکھی گئی ہے مگر مولف نے اسے ان چار ہی موضوعات، حمد باری تعالیٰ، قوانین جنود، احکام عامہ،

رفاہی قوانین تک محدود رکھا ہے اور اسی کو قرآن کی عظمت واضح کرنے کے لیے کافی سمجھا، وہ خود اپنی کوئی رائے نہیں دیتے، نہ کسی طرح کی وضاحت کرتے ہیں اور نہ کوئی تنقید کرتے ہیں، تاہم ان کی کتاب کی اہمیت مسلم ہے، یہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے امور ومسایل میں مدد دیتی ہیں۔

۸-چندر بلی پانڈے: قرآن میں ہندی

سرسوتی مندر، بنارس، ۱۹۴۵ء، کل صفحات ۵۹۔

یہ کتاب ہندی زبان میں ہے، مصنف کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں ہماری مذہبی کتابوں سے اشتراک وموافقت کے مختلف پہلو ہیں، اس کتاب میں ان ہی کو دکھانا مقصود ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہندو مسلم کو قریب تر کرنے کی یہ ایک مبارک کوشش ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے عرب وہند کے تعلقات میں قرآن مجید کے ان تین لفظوں مشک، کافور اور زنجبیل کو ہندی الاصل بتایا ہے، ان کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے بہ کثرت قرآنی الفاظ کی اصل سنسکرت زبان ہے جو سنسکرت کی کتابوں شروتی یا اپنشد وغیرہ میں مذکور ہیں، جیسے ''توبہ'' کا لفظ چندوگی اپنشد کے لفظ ''اشوتھا سوما سونا ھو'' سے ملتا جلتا ہے، اسی طرح ''نمارق''، سنسکرت کے لفظ ''نمرا'' کی تعریب اور ''استبرق''، ''استھاور'' کا ہم شکل ہے، انہوں نے اس طرح کے الفاظ کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے، جن کی اصل ان کی نگاہ میں ہندی ہے اور وہ قرآن میں شامل ہیں۔

مصنف نے ''دہرودیا'' کو کافی تفصیل سے بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ قرآن مجید کی سورہ دہر اس سے ملتی جلتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ سورہ دہر میں دہر کا جو معنی ہے وہ اپنشد کے مذکورہ معنی سے مشابہ تو نہیں مگر ان کے خیال میں دونوں کتابیں اس لفظ کے تحت ایک ہی جیسا بیان پیش کرتی ہیں، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کا لفظ ''دہر'' اپنشد کے ''دہر'' سے مشابہ ہے، اپنی تایید میں مصنف نے مناسب مقامات پر دونوں زبانوں کے علما کے اقوال نقل کیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مصنف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کے بیانات اپنشد کے بیانات وتوضیحات پر مبنی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کے درمیان محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تھی وہ ہندوستان کے لوگوں سے بالکل مختلف تھے، دونوں اقوام کے حالات کے اختلاف کے سبب ان کے موضوعات ومشتملات میں بھی

اختلاف پایا جاتا ہے ورنہ قرآن بھی عربوں کے لیے ویسا ہی مواد فراہم کرتا ہے جس طرح کا اپنشد نے ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا تھا۔

قرآنی لفظ ''عرش'' اور شروتی کے لفظ ''اسندی'' کے متعلق کہتے ہیں کہ ''اسندی'' جیسا کہ اتھروید میں مذکور ہے برہما کا عرش ہے اور یہ قرآنی لفظ ''عرش'' کا مشابہ ہے کیوں کہ دونوں کتابوں میں یہ اشارہ ہے کہ یہ آٹھ لوگوں کے ذریعہ اٹھایا گیا ہے، اپنی تایید میں انہوں نے آتیر ابرہمن کے مطابق اندر کی شاہی محل میں آمد کی وضاحت کی ہے، انہوں نے اس سے متعلق سورۃ الحاقۃ کی سترہویں آیت کا بھی حوالہ پیش کیا ہے۔

جناب پانڈے قرآنی لفظ ''کرسی'' کی وضاحت میں ناکام نظر آتے ہیں مگر انہوں نے منطقی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندی کتابوں کا لفظ ''پرنیک'' اس قرآنی لفظ کا مشابہ ہوسکتا ہے، اس بیان کی تایید میں انہوں نے ہندی کتابوں کے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔

اس کتاب میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ قرآنی مشتملات اپنشد سے ماخوذ ہیں، اپنی تایید میں انہوں نے داراشکوہ کے حوالہ سے سورۃ الواقعہ کی ۷۸ویں آیت میں مذکورہ لفظ ''مکنون'' پر بحث کی ہے، انہوں نے مسلمان علما کی اس تشریح وتاویل سے انکار کیا ہے کہ کتاب مکنون سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔[1]

آخر میں مصنف نے یہ بھی کہا ہے کہ اپنشد کی توضیحات اور بعض ہندوستانی قبایل کے اسماء بھی محمد ﷺ کے اقوال میں جگہ پاگئے ہیں، اسے واضح کرتے ہوئے ہندو اور مسلم محققین کے دلایل بھی دیے ہیں۔

زبان وبیان کے لحاظ سے کتاب موثر نہیں ہے، اس میں روانی کا فقدان بھی ہے، کتاب کے عنوان سے پتا چلتا ہے کہ مصنف قرآن میں مستعمل ہندی الفاظ سے بحث کرے گا اور گو اس نے ابتدا بھی اسی سے کی ہے مگر بعد میں ان کی اصل توجہ اس کی طرف ہوگئی ہے کہ قرآنی بیان اپنشد کے بیان

---

[1] معارف: داراشکوہ نے بھی عام مسلمان علما کی طرح کتاب مکنون سے لوح محفوظ ہی مراد لیا ہے البتہ آیت میں قرآن مجید کے بارے میں یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ لوح محفوظ میں ہے، اس سے اس کے نزدیک ''اپ نشد'' مراد ہے نا کہ یہ قرآن مجید جسے مسلمان علما لوح محفوظ میں بتاتے ہیں ''ض''۔

سے مشابہ ہے اور اپنشد ہی قرآن کا مرجع و ماخذ ہے، ان کا یہ بیان اتنا قوی، باوزن اور مدلل نہیں کہ ہر شخص اسے تسلیم کرے تاہم بعض الفاظ و افکار کے تعلق سے ہندومت اور اسلام میں اشتراک و مشابہت دکھانے میں وہ کامیاب معلوم ہوتے ہیں۔

۹۔مگن لال اے، بوچ: Ethics of The Qur'an

خود مصنف نے اپنے خرچ پر بروڈا سے ۱۹۷۷ء میں شایع کیا ہے، اس کے کل صفحات ۱۲۹ ہیں۔

مصنف کو مختلف مذہبی موضوعات پر لکھنے کا ایک طویل تجربہ ہے، زیر مطالعہ کتاب کے علاوہ انہوں نے حسب ذیل کتابیں ''Zooastrian Ethics''، ''The Spirit of Ancient Hindu Culture''، ''The Philosophy of Shankara'' اور ''The Principles of Hindu Ethics'' تحریر کی ہیں۔

کتاب کی ابتدا خود مصنف کے مقدمہ سے ہوتی ہے، جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ کتاب قرآن کے انگریزی ترجمے پر مبنی ہے، اس کے لکھنے کا اصل مقصد اسلامی عقیدہ کے اصول و مبادی اور ضروری چیزوں کی تفہیم ہے، مصنف لکھتا ہے ''میں اپنی محنت کے نتایج کو اس لیے پیش کرتا ہوں کہ ہندو ایمان داری سے اسلام کی روح کو سمجھنے کی کوشش کریں اور قرآنی اصول کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں جو ان کے شاستروں سے ملتا جلتا ہے''۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں قرآن مجید کے فلسفیانہ پہلو کی وضاحت کی گئی ہے اور خدا کے وجود، توحید اور قرآن مجید کے ان مرکزی اصولوں کے فایدے بیان کیے گئے ہیں جن کے گرد تمام قرآنی تعلیمات گردش کر رہی ہیں، اسی سلسلے میں نماز، روزہ اور حج وغیرہ سے متعلق قرآنی ہدایات اور قرآن کے فلسفہ ایمان و عمل کی تشریح بھی کی ہے، مصنف کہتے ہیں کہ محبت و بغض اللہ کے لیے ہونا چاہیے، انسان کی نیت درست ہونی چاہیے اور اس کے اندر اخلاص ہونا چاہیے، ایمان و یقین کو اس کے دل میں پیوست ہونا چاہیے، اصل اعتبار اسی ایمان و اعتقاد کا ہوتا ہے نا کہ ظاہری ایمان و اعتقاد کا۔

وحی الٰہی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور قرآن مجید سے اس کے منزل من اللہ ہونے کے

دلایل بیان کیے گئے ہیں، وہ گزشتہ انبیا و کتب سماویہ پر ایمان لانے کو بھی ضروری قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسان کی تقدیر اور کاینات کا نظام اور اس کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے، آخرت اور جزا و سزا وغیرہ کا ذکر بھی اسی حصے میں ہے۔

دوسرے حصے میں کل سات ابواب ہیں، پہلے باب میں عملی زندگی سے متعلقہ مسایل کا ذکر ہے مثلاً قرآن مجید دنیا کے مال و متاع سے لطف اندوز ہونے کو جایز قرار دیتا ہے لیکن دنیا کی محبت میں گرفتار ہونے اور مال و زر کے پیچھے دیوانے ہوجانے کو ناپسند کرتا ہے، محنت و مشقت سے کسب کی اجازت دیتا ہے اور صبر و قربانی کی اہمیت بیان کرتا ہے۔

دوسرا باب انسانی حقوق سے متعلق ہے، اس میں جہاں صداقت، اخلاص نیت، عدل و احسان، ایفاے عہد اور اداے قرض وغیرہ پر زور دیا ہے وہاں کفر و نفاق، چوری اور ڈکیتی وغیرہ کی شناعت قرآن کی روشنی میں بیان کی گئی ہے، ترکہ و میراث کے سلسلے کی ہدایات کا ذکر بھی ہے۔

تیسرا باب عائلی زندگی سے متعلق ہے، اس میں زواج، مقصد زواج، زوجین کے حقوق اور باہمی معاشرت نیز نکاحِ بیوگان وغیرہ کا ذکر ہے۔

چوتھے حصے میں بتایا گیا ہے کہ والدین، اولاد، اعزہ اور دوسرے اہل تعلق سے کس طرح کا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔

پانچواں باب قرآن کے ثقافتی اور تعلیمی تصور سے بحث کرتا ہے اور چھٹا باب اہل کتاب اور دوسری اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے سلوک اور برتاؤ کے متعلق ہے، اس سلسلے میں اسلام اور مسلمانوں کی رواداری کو واضح کیا گیا ہے، ان کا خیال ہے کہ جب کفار مسلمان کے شدید دشمن بن جائیں اور ان پر ظلم و ستم ڈھائیں تو ان سے جہاد کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس سلسلے میں اسلام کے آئین جنگ کا مفصل ذکر کیا ہے۔

ساتویں اور آخری باب میں دکھایا ہے کہ دنیا میں دو متقابل گروہ پائے جاتے ہیں، حزب اللہ اور حزب الشیطان، انہوں نے ان دونوں کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں، اسی باب میں موقع کی مناسبت سے عدم تشدد (اہنسا) کا ذکر بھی آگیا، مصنف کے خیال میں یہ قرآنی تعلیمات

سے ہم آہنگ ہے، اس کے اثبات میں قرآنی آیات سے مثالیں پیش کی ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف قرآن مجید کے فلسفۂ اخلاق سے اچھی طرح واقف ہیں، انہوں نے عملی فلسفۂ اخلاق سے بھی بحث کی ہے، کتاب کی بڑی خوبی اس کی سلاست اور دل نشینی ہے، مصنف نے اپنی ہر بات قرآنی دلایل سے اس طرح سمجھایا ہے کہ کہیں ان کے خیال کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، انہوں نے اس میں صرف قرآنی فلسفۂ اخلاق ہی نہیں بیان کیا ہے بلکہ اسلام کے بارے میں پوری معلومات فراہم کردی ہیں، مقدمہ میں مصنف نے بتایا ہے کہ وہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات سے پوری طرح متفق ہیں۔

عموماً اس طرح کی کتابیں تنقیدی تجزیے سے خالی ہوتی ہیں، اس کے دو سبب ہوسکتے ہیں:

۱- قرآنی افکار و تصورات اتنے مکمل اور جامع ہیں کہ ان پر نقد احتساب کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہوتی۔

۲- دوسرا سبب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے ذہن میں کوئی بات کھٹک کی ہوتی بھی ہے تو وہ اس خوف سے اس کا اظہار نہیں کرتا کہ وہ خود ہی تنقید کا نشانہ بن جائے گا مگر مصنف کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ قرآنی فلسفۂ اخلاق سے پوری طرح متاثر ہے۔

مصنف نے بہت سے خاص تصورات کو داخل کرنے کی کوشش کی ہے جیسے اہنسا وغیرہ، اس نے کفار کے ساتھ برتاؤ اور خدا کے لیے جانوروں کی قربانی کو بھی ثابت کیا ہے۔

مصنف نے صرف سورتوں کے حوالے دینے پر اکتفا کیا ہے اور آیات کے حوالے نہیں دیے ہیں، اس سے عام قاری کو آیتوں کی تلاش میں دشواری ہوگی۔

یہ کتاب مسلمانوں کے مطلب کی نہیں ہے کیوں کہ وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ قرآنی تعلیمات سے واقف ہیں مگر یہ ایک اچھی قرآنی خدمت ہے جو غیر مسلموں کے لیے مفید ہے، توقع ہے کہ وہ اس سے فایدہ اٹھائیں گے۔

☆☆☆

سوانح نگاری کے اصول

از:- مولانا مظہر الاسلام قاسمی☆

(۲)

سوانح عمری کی تعریف سوانح نگاری کے اصول و قواعد مرتب کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سوانح عمری کی تعریف بیان کردی جائے تاکہ قارئین اس کی حقیقت سے آشنا ہوکر اس کی روشنی میں اس کے اصول و قواعد کا مطالعہ کریں۔

سوانح عمری کیا ہے؟ افراد کی نجی اور اجتماعی زندگی کی حقیقی آئینہ دار اور ان کے محاسن و معایب کی واقعی مرقع، جس میں سنہ وار ان کی زندگی کے تمام حوادث و واقعات درج کیے گئے ہوں، غرض زندگی کی کامل، اصلی اور سچی تصویر کا نام سوانح عمری ہے۔

مذکورہ تعریف کے پیش نظر سوانح عمری کے لیے دو چیزیں ہونا لازمی ہیں، ایک یہ کہ صاحب سوانح کے جملہ سوانح من وعن حوالہ قلم کیے جائیں، دوسرے یہ کہ اس کے محاسن کے ساتھ اس کے معایب بھی بیان کیے جائیں، ان دو چیزوں کے علاوہ اس کی پیدایش اور وفات کی تاریخیں، سنہ اور جائے ولادت اور وہاں کے ماحول کا اجمالی تذکرہ بھی کیا جائے، اس لحاظ سے سوانح نگار کی دو اقسام ہیں، ایک یہ کہ اس کی سوانحی معلومات بلا واسطہ ہوں، دوسرے یہ کہ بالواسطہ ہوں، پہلی صورت میں اس کا فرض ہوگا کہ وہ بے کم و کاست اپنے چشم دید واقعات و حالات سپرد قلم کرے، دوسری صورت میں اس کا فرض ہوگا کہ تاریخی روایات کی طرح سوانحی روایات کو بھی تحقیق کی کسوٹی پر جانچ کر حقیقت کا پتہ لگائے اور بالکل بے لاگ ہوکر سوانح نگاری کے فرایض انجام دے۔

تحقیق کی دو کسوٹیاں:

جیسا کہ اس سے پہلے تاریخ کے باب میں گزر چکا ہے کہ تحقیق کی دو کسوٹیاں ہیں، ایک روایت،

☆ آسام دارالحدیث، جے نگر مدرسہ، نیل باگان، ضلع نوگاؤں، آسام۔

دوسرے درایت، ان دونوں کے جو اصول و قواعد وہاں بیان کیے گئے ہیں، وہی یہاں بھی کام آئیں گے لیکن سوانحی درایت کے کچھ اصول اور بھی ہیں، جو واقعات و حالات کی تحقیق کے لیے مفید اور کارآمد ہیں، چنانچہ صدیق اکبر کا مصنف لکھتا ہے:

۱- واقعہ کا جو اصل راوی ہے، اس کے تعلقات صاحب واقعہ یعنی جس کے متعلق وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے ساتھ کس قسم کے تھے؟۔

۲- جو واقعہ اس کی نسبت بیان کیا گیا ہے، کیا اس کے مسلمہ اوصاف و کمالات کے پیش نظر اس واقعہ کا صدور اس سے ہوسکتا ہے؟۔

۳- نفس واقعہ کی نوعیت کیا ہے؟ صاحب واقعہ سے قطع نظر کیا وہ واقعہ اس ماحول میں پیش بھی آسکتا تھا؟۔

۴- اگر واقعہ کو صحیح مان لیا جائے تو طبعاً اس پر جو نتائج مرتب ہونے چاہیں وہ ہوئے یا نہیں؟۔(۱)

معایب کا تذکرہ سوانح عمری میں محاسن کے ساتھ معایب بھی ذکر کیے جائیں یا نہیں؟ اس بارے میں محققین مختلف الرائے ہیں، چنانچہ عقادؔ اپنی کتاب 'عبقریۃ الصدیق'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے دوست فاضل محقق جناب احمد امین صاحب، ڈاکٹر ہیکل پاشا کی کتاب ''الصدیقؓ'' اور میری کتاب 'عبقریۃ عمرؓ'' پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے ریمارک فرماتے ہیں......
>
> اور ایک اہم مسئلہ باقی رہ گیا، جس میں مصنفین کے نظریات کثرت سے مختلف ہیں، وہ یہ ہے کہ بڑے لوگ چاہے جتنے بھی بڑے ہوں، ان سے خطائیں ضرور سرزد ہوں گی، ورنہ وہ انسان نہیں کیوں کہ عصمت اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے تو کیا اندریں صورت سوانح نگار کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان سب کو تفصیل کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرے اور ان کے تمام حالات بیان کرکے ان کے مدحیہ پہلوؤں کو اجاگر کرے اور ان کی خطا کاریوں کا ذکر کرکے ان پر نقد کرے اور ان کی عظمت کے پہلوؤں سے درس عظمت دے اور ان کی خطا و لغزش کے مواقع سے درس عبرت یا

> سوانح نگار کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنے موئے قلم سے صرف ان کے نقوش عظمت کو ابھارے اور ان کی خطا و لغزش کے پہلوؤں سے ہمیشہ تاویل و دفاع کرے، خود ابوبکرؓ و عمرؓ کی اقتدا و پیروی کرتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ پہلا نظریہ درست ہے، حالاں کہ مذکورہ دونوں فاضل مولف دوسرے نظریے کی طرف زیادہ مائل ہیں''۔

عقاد اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہی ہے جیسا کہ ہمارے فاضل دوست نے لکھا ہے کہ ہم دوسرے نظریے کی طرف زیادہ مائل ہیں''۔

سوال یہ ہے کہ مذکورہ دونوں نظریوں میں سے انہوں نے دوسرا نظریہ کیوں اختیار کیا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

اور ہم سمجھتے ہیں کہ زمانہ گزشتہ کی بہ نسبت یہ نظریہ ہمارے اس زمانے میں نہایت ضروری ہے، کیوں کہ اٹھارہویں صدی سے اب تک وہ اسباب کثرت سے رونما ہورہے ہیں جو وقار و عظمت کو پامال کررہے ہیں اور یہ کبھی از خود پیدا ہوجاتے ہیں اور کبھی دیدہ و دانستہ پیدا کیے جاتے ہیں جن سے بچنے کا اشارہ اس وقت کارگر ثابت ہوگا جب کہ اس کا کوئی راستہ بھی ہو۔

درحقیقت یہ اسباب جدید علمی ترقی کے آغاز دور سے سائنس دانوں اور علما کے باہمی اختلافات کو غلط طور پر سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے، کیوں کہ بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات جم گئی کہ علم جدید نے اپنے اگلے مصلحین اور طالبان معرفت الٰہی اور طالبان دنیا کی کاوشوں کو لغو کردیا ہے۔

اور کچھ لوگوں نے ان مذہبی رہنماؤں کو جنہوں نے اصلاح عقاید کے فرایض انجام دیے، ان مذہبی رہنماؤں سے خلط ملط کردیا، جنہوں نے مذہبی عقاید کو گراں محسوس کرکے دیدہ و دانستہ حقایق کا انکار کردیا اور عناد و اصرار کی وجہ سے تہذیب و ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔

پھر جمہوریت کا دور آیا جس کے متعلق بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی، جس طرح سائنس و مذہب کی باہمی نزاع کے متعلق غلط فہمی ہوئی تھی، چناں چہ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ چھوٹے لوگوں کی آزادی انہیں بڑے لوگوں کی صف میں داخل کردے گی اور قانونی مساوات طبعی امتیازات اٹھا دے گی اور

ظالم افسروں کے خلاف بغاوت کے معنی ''ہر عظیم الرتبت شخصیت کے خلاف بغاوت کرنا'' ہیں، حالاں کہ یہ سارے خیالات صریحاً غلط تھے لیکن اس کے باوجود لوگوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوئے، جس کے نتیجے میں ہر ''عظمت انسانیت'' پر ظلم و زیادتی ہونے لگی اور اسے حقیر سمجھنے اور اس پر عیب لگانے کی بدعت پھیل گئی، حتی کہ مستحق توقیر شخصیت کی توقیر اس پوزیشن میں ہوگئی کہ اس پر عیب لگایا جائے۔

پھر کمیونزم کا دور آیا جو اس خیال پر قایم ہے کہ سماجی سربراہ اسے ضایع کرنے والے ہیں، اس پر فضل و احسان کرنے والے نہیں ہیں اور یہ کہ گزشتہ سربراہوں کی تعظیم لوگوں کو ان اجتماعی نظاموں کے عیوب سے صرف نظر کرائے گی، جو انہوں نے قایم کیے جن میں سے بعض سربراہوں نے بہ قصد و تدبیر اور بعض نے بے قصد و تدبیر ان کی خدمات انجام دیں۔

اور کمیونسٹوں نے ہر اس قدر و عظمت کو غبار آلود کرنے میں حد سے تجاوز کیا جس کی توقیر و تعظیم ان کے فکر و خیال کی تردید اور ان کی دعوت کی مخالفت کی طرف لے جا سکتی تھی، ان کی یہ نامعقولیت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے شکسپئر اور ان جیسے دوسرے ڈرامہ نگاروں کے ڈراموں میں ہیروؤں کے احوال و کوائف بھی بدل دیے، چنانچہ انہوں ہملٹ کو ڈرامے میں ٹھیک اس کے برعکس جو شاعر مذکور نے اس کی قلمی تصویر کھینچی تھی، کمینہ، مکار اور بدنیت کی صورت میں پیش کیا، اس لیے کہ قرون وسطی کے امرا میں سے کسی امیر و سربراہ کی اچھی تصویر ان اجتماعی اور سیاسی نظاموں کے لیے مخل تھی، جو انہوں نے اس زمانے میں قایم کیے۔

اسی طرح بڑی شخصیات کے مراتب گھٹانے کے اسباب روز افزوں ہوتے گئے، حتی کہ قدر و عظمت اس کی محتاج ہوگئی کہ اسے قانونی زبان میں ''اعتبار کی واپسی'' سے موسوم کیا جائے، اس لیے کہ انسانیت اگر اونچی شخصیات کے حقوق نہ پہچانے تو وہ انسانی حقوق میں سے کوئی حق نہ پہچانے گی اور یہ کہ اگر عظمت انسانیت پرانے یا نئے زمانے میں کوئی چیز نہ ہو تو پوری انسانیت کوئی چیز نہ ہوگی۔ (۲)

ان مذکورہ وجوہ و اسباب سے جو عقاد نے بیان کیے، قارئین نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ ان کا نظریہ تقاضائے وقت کے مطابق ہے تاہم یہ نظریہ اس کی ماہیت اور حقیقت کے خلاف ہے،

چنانچہ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

> ''سلف امت کے خیر و شر، عدل و ظلم، استحقاق و غیر استحقاق، محاسن و قبائح، طاعات و معاصی اور فضایل و رذایل کے نقل کرنے کا نام ''علم تاریخ'' ہے، تاکہ پڑھنے والے خلف ان سے عبرت حاصل کریں اور جہاں داری، نیکوکاری اور بدکرداری اور جہاں بانی کے منافع و مضار سے واقف ہوں اور اس نیکوکاری کے اندرون کا اتباع کریں اور بدکرداری سے پرہیز کریں''۔ (۳)

رسالہ ''معارف'' اعظم گڈھ بابت ماہ جون ۲۰۰۲ء میں وفیات کے تحت ''ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی'' کے زیرعنوان جناب پروفیسر سید عبدالرحیم کا ایک تعزیتی مضمون شایع ہوا ہے، جس میں وہ ان کے محاسن بیان کرتے ہوئے آخر میں یوں لکھتے ہیں:

> ''عظیم شخصیتیں بھی کمزوریوں سے مبرا نہیں ہوتیں، یہ لازمۂ بشریت ہے، ڈاکٹر صاحب مزاجاً سخت گو اور سخت گیر تھے جو بات نرمی سے کہی جاسکتی تھی اور اس کا حل آسانی سے نکل سکتا تھا اسے بھی وہ سخت لہجے میں کہتے، جس کے نتیجے میں ماحول کی فضا مکدر ہوجاتی، جو لوگ ان کے مزاج سے واقف تھے وہ تو کچھ برا نہیں مانتے لیکن نئے لوگ ان سے دور ہو جاتے برخلاف اس کے ان کا دل بالکل پاک تھا، فوراً ان کو احساس ہوجاتا اور وہ معافی مانگ لیتے''۔

کھلی بات ہے کہ اس میں انہوں نے ان کے محاسن و معایب دونوں اخلاقی پہلو اجاگر کیے ہیں، ان کا یہی امتزاج اور اس میں حسن اعتدال حقیقی سوانح نگاری ہے، جس پر واقعی اس کی تعریف صادق آتی ہے، سوانح نویسوں کو اسی طرز کی پیروی کرنی چاہیے، علمائے سلف نے یہی طریقۂ کار اختیار کیا تھا جس کی بنا پر ''اسماء الرجال'' جیسا عظیم الشان فن وجود میں آیا اور اس میں میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب اور تقریب التہذیب وغیرہ جیسی اہم کتابیں تصنیف کی گئیں، جن سے آج ہمیں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں علما کے صحیح حالات معلوم ہوجاتے ہیں، اگر وہ ایک ہی پہلو پر قلم اٹھاتے اور دوسرے پہلو کو نظر انداز کردیتے تو ان کے صحیح حالات ہمیں معلوم نہ ہوتے، پھر ان کی ثقاہت و عدم ثقاہت کا فیصلہ مشکل ہوجاتا۔

جیسا کہ آگے تفصیل سے ذکر کیا جائے گا کہ عموماً چوں کہ اونچی شخصیات پر معتقدین ہی قلم

اٹھاتے ہیں، اس لیے ان کی طرف سے ان کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنے سے پہلوتہی کی جاتی ہے۔

چند شرائط تاریخ نگاری کی طرح سوانح نگاری کے لیے بھی چند شرائط ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱- سوانح نگار متعلقہ شخصیت (HERO) کے جملہ اہم سوانح زندگی سے واقف ہوں جن کو وہ معروضی انداز میں حوالۂ قلم کریں، اگر کوئی سوانح نگار اس کے اہم سوانح سے واقف نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ان کو قلم بند کرنے سے قاصر ہوگا جس کی وجہ سے اس کی سوانح عمری ناقص اور ادھوری رہ جائے گی۔

۲- وہ موقع کا لحاظ کرتے ہوئے صراحتاً یا اشارتاً محاسن کے ساتھ معایب بھی بیان کریں، چنانچہ ''روضۃ الصفا'' کا مصنف لکھتا ہے:

''دوسری شرط یہ ہے کہ مورخ کو چاہیے کہ جو کچھ لکھے، بیان واقعہ لکھ کر مجموعۂ حالات کو قید کتابت میں لائے، یعنی جیسا کہ فضایل ومحاسن کا ذکر کرے اور ان کو پردے میں نہ رکھے، اسی طرح اگر مصلحت سمجھے تو کھلے طور پر بیان کرے ورنہ رمز وکنایہ اور ایما واشارہ کا طریقہ اختیار کرے اور عقل مندوں کے لیے اشارہ کافی ہے''۔ (۴)

علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں:

''اور مشہور روایت نقل کرنا کافی نہ ہوگا جب کہ اس کی بنا پر اہل علم وصلاح میں سے کسی کے حق میں کوئی مفسدۂ طعن مرتب ہوتا ہو، بلکہ اگر حقیقت میں پوشیدہ حال کے حق میں کوئی عیب لگانے والی بات ہو تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس کے فشا میں مبالغہ نہ کرے اور اشارے پر اکتفا کرے''۔ (۵)

مزید برآں وہ فرماتے ہیں:

''اور اسی طرح وہ ان واقعات سے پرہیز کرے جن سے اس کی تنقیص ہوتی ہو جو اس کی جوانی میں صادر ہوئے، جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد مقتدیٰ بنایا ہو، کون ہے جو (کلیتاً اخلاقی کمزوری سے) محفوظ ہو؟''۔ (۶)

مذکورہ رسالہ ''معارف'' اعظم گڈھ بابت ماہ جنوری ۲۰۰۲ء میں ''وفیات'' کے تحت ''ڈاکٹر خورشید احمد فارقؔ'' کے زیر عنوان پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا ایک تعزیتی مضمون شایع ہوا

ہے، جس میں وہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''......وہ بہت کم آمیز تھے، گفتگو میں خود پہل نہیں کرتے تھے، کسی نے کچھ پوچھا تو آنکھیں بند کر کے دو ایک جملے میں جواب دے دیا اور پھر خاموش ہوگئے، ایک آدھ بار شعبے میں ان کے پاس حاضر ہوا، کلاس میں فارغ تنہا بیٹھے تھے، میں نے انہیں بتایا کہ علی گڈھ آنے سے پہلے پٹنہ میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ زیاد بن ابیہ پر کام کر رہے ہیں، خاموش رہے، نہ یہ پوچھا کس نے کہا اور نہ کسی قسم کی خوشی یا دل چسپی کا انہوں نے اظہار کیا، میں ایک آدھ بات کر کے اٹھ آیا''۔

اس تعزیت نامے میں محاسن کے ساتھ معایب کا معتدل تذکرہ ہے، یہی مذکورہ مورخین برنی اور سخاوی کی اوپر کی ہدایات کا مقصود ہے، سوانح نگار کو چاہیے کہ سوانح نگاری میں اس طرز کی پیروی کرے اور متعلقہ شخصیت کے محاسن کے ساتھ اس کے معایب کا معتدل انداز میں تذکرہ کرے۔

۳- وہ مدح وذم میں افراط وتفریط سے بچے، چنانچہ برنی لکھتا ہے:

''مدح وذم میں افراط وتفریط سے احتراز واجب سمجھے اور الحاح (یعنی بے جا خوشامد) جایز نہ رکھے اور اگر کسی جلب منفعت یا دفع مضرت کی وجہ سے (اس کے بغیر کوئی) چارہ نہ ہو تو خیر الامور اوسطہا کے مضمون سے تجاوز نہ کرے''۔ (۷)

''تاریخ الاسلام'' کے مصنف اکبر شاہ نجیب آبادی حضرت امیر معاویہؓ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت امیر معاویہؓ اپنی حکومت قایم کرنے اور اپنی قوم اور خاندان کے اقتدار کو بنو ہاشم پر فایق کرنے کے ضرور خواہش مند تھے لیکن ساتھ ہی وہ اپنی اس خواہش کے پورا کرنے میں کسی ایسے شخص کو چیرہ دستی کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے، جو بنو امیہ اور بنو ہاشم یا معاویہؓ اور علیؓ دونوں کا یکساں دشمن ہو یا سلطنت عثمانیہ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو''۔

حضرت معاویہؓ کے رویے پر نجیب آبادی کا یہ تبصرہ مذکورہ شرط کے مطابق ہے، جس میں مدح وذم دونوں میں افراط وتفریط سے احتراز کیا گیا ہے، سوانح نگار اسے مشعل راہ بنائیں اور اس

کی روشنی میں سوانح قلم بند کریں، امید ہے کہ ان کی تحریر بھی افراط و تفریط سے محفوظ رہے گی اور معتدل ہوگی۔

۴-عقیدت و محبت یا نفرت و عداوت کے جذبات سے عاری ہوکر سوانح قلم بند کریں، جس سوانح عمری میں سوانح نگار کا کوئی جذبہ کارفرما ہوگا وہ سوانح عمری بہ قدر جذبہ غیر واقعی اور غیر معروضی ہوگی۔

''معارف'' مذکورہ میں بہ ماہ مئی ۲۰۰۲ء میں مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کے سانحۂ وفات پر ایک قابل قدر تعزیتی مضمون شایع ہوا ہے، جس میں سانحہ نگار ان کے متعلق لکھتا ہے:

> ''افسوس اور سخت افسوس ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، آل انڈیا ملی کونسل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے بانی اور جنرل سکریٹری، امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کے قاضی القضاۃ و نایب امیر شریعت اور ملک و بیرون ملک کے متعدد علمی و تعلیمی اور مذہبی اداروں کے رکن مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب ۴/اپریل ۲۰۰۲ء کو وفات پاگئے، انا للہ و انا الیہ راجعون''۔

پھر وہ آگے چل کر لکھتا ہے:

> ''وہ ضلع دربھنگہ (بہار) کے قصبہ جالہ میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے، اسلامی عہد میں ان کا خاندان عہدۂ قضا پر فایز تھا، ان کے والد بزرگوار مولانا عبدالاحد صاحب ممتاز عالم دین اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، اپنے ضلع کے بعض مدارس میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا، ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم دیوبند پہنچے اور اس وقت کے اکابر علما سے کسب فیض کیا، ۱۹۵۵ء میں وہاں سے فراغت کے بعد جامعہ رحمانی مونگیر میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے''۔

اس میں ان کے سانحہ نگار نے پہلے قاضی صاحب مرحوم کے ذاتی اوصاف ذکر کیے، پھر ان کے نجی حالات قلم بند کیے ہیں جو واقعہ کے مطابق ہیں، اس میں محبت یا نفرت کسی قسم کا کوئی جذبہ کارفرما نظر نہیں آتا، سوانح نگار یہی طریقہ اپنائیں اور اپنے مثبت یا منفی جذبے سے عاری

ہوکر سوانح لکھیں، اس سے ان کی سوانح عمری معیاری اور وزنی ہوگی۔

۵- ولادت اور وفات کا سنہ لکھیں، چنانچہ ''اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں'' کا مصنف لکھتا ہے:

> ''ہندوستانی مصنفین نے اپنے شوق و دلچسپی سے ملوک و سلاطین کے حالات اور ان کے جنگی کارناموں اور مشایخ کے حالات اور ان کے کشف و کرامات کے حالات و واقعات اور شعرا کے حالات اور ان کے دواوین کے منتخب اشعار کے نمونہ پر کتابیں لکھی ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں عبارت آرائی اور مسجع مقفی الفاظ بہت کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں، دوسری قابل افسوس بات یہ ہے کہ علما و صلحا کے حالات میں ان کی ولادت و وفات کا کوئی تذکرہ نہیں، حالاں کہ اس کی سخت ضرورت تھی''۔(۸)

۶-شروع میں پیدایشی اور رہایشی جگہوں کے جغرافی حالات لکھیں جیسا کہ ''سیرۃ النبیؐ'' کے شروع میں عرب کے جغرافی حالات لکھے گئے ہیں۔

۷- جس دور میں صاحب سوانح (HERO) پیدا ہوا ہے، اس دور کے ان افکار و نظریات اور انقلابی تحریکات کا تذکرہ بھی کریں جن سے وہ متاثر ہوا اور اس کی زندگی میں ان کا رنگ نمایاں ہوا، ''حیات سرسید''، ''حیات شبلی'' اور ''حیات سلیمان'' اس کے چند مثالی نمونے ہیں جن کو ضرورت مند اپنی بصیرت و آگہی کے لیے دیکھ سکتے اور بہ اطمینان ان کی پیروی کر سکتے ہیں۔

۸-اس کا سلسلہ نسب بیان کر کے اس کے آبا و اجداد کے مختصر حالات زندگی حوالۂ قلم کرے، جیسا کہ ''سیرۃ النبیؐ'' اور ''سیرت مصطفیٰ'' وغیرہ میں نبی ﷺ کا سلسلۂ نسب بیان کر کے آپؐ کے آبا و اجداد کے مختصر حالات زندگی حوالۂ قلم کیے گئے ہیں۔

۹-سادہ اور سلیس پیرایے میں سوانح قلم بند کرے، جیسا کہ ''حیات سرسید'' میں اسی پیرایے میں سوانح قلم بند کیے گئے ہیں۔

۱۰- زبان اور اسلوب بیان پر پوری قدرت ہو کیوں کہ اس کے بغیر سوانحی خاکہ اچھی طرح مرتب نہیں کیا جا سکتا، علامہ شبلی اور ان کے اسکول کے تمام تلامذہ کے زرنگار قلم میں یہ زریں وصف

بہ درجۂ کمال پایا جاتا ہے، ناظرین ان کی تصانیف کا مطالعہ کریں اور خود اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کریں۔

اسلوب نگارش چونکہ تاریخ میں آفاقی اور عمرانی سوانح عمری میں نجی اور شخصی حالات و واقعات بیان کیے جاتے ہیں، اس لیے ان دونوں اصناف کے اسلوب نگارش میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے، اس وجہ سے پہلی صنف کی طرح دوسری صنف بھی سادہ، سلیس اور بے تکلف اسلوب کی متقاضی ہے جس میں سجع بندی، انشا پردازی، عبارت آرائی اور رنگ آمیزی سے مکمل اجتناب کیا جاتا ہے کیوں کہ ان تکلفات و تصنعات سے سوانح کی اصلی صورت بدل سکتی اور وہ کچھ سے کچھ ہوسکتی ہے۔

مثالی اسلوب نگارش ''الفاروق'' اس کا ایک مثالی نمونہ ہے جس کے اسلوب میں یہ نقائص نہیں پائے جاتے، لہٰذا اس صنف میں اس کے اسلوب کی پیروی کی جاسکتی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں مولانا حالیؒ کا اسلوب سادہ، سلیس اور رواں ہے، جو سوانح نویسی کے لیے موزوں اور مناسب ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قارئین عموماً ان کے اسلوب میں کچھ ''پھیکا پن'' محسوس کرتے ہیں، جن لوگوں نے ''حیات سرسید'' کا مطالعہ کیا ہے وہ ہمارے اس تاثر سے اتفاق کریں گے، باوائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا اسلوب ان سے اچھا اور عمدہ ہے، جس میں یہ خامی نہیں ہے، ان کے اسلوب میں سادگی کے ساتھ ادبی چاشنی بھی ہے، اردو کی مختلف کتابوں پر انہوں نے جو مقدمے لکھے ہیں ان میں اس کی چند جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مولانا شبلیؒ کا کیا کہنا! ان کا اسلوب سب سے اچھا اور سب سے عمدہ ہے، وہ ہرفن مولا اور ہر صنف کے باوا ہیں، سوانح عمری ہو یا تاریخ، سیرت ہو یا تنقید، ہر صنف کے مزاج داں اور ادا شناس ہیں اور اس کے مطابق اس کے لیے اسلوب اختیار کرتے ہیں، مذکورہ کتاب ''الفاروق'' کے علاوہ ''سیرت النبی''، ''شعر العجم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' ان کی چند سوانحی تصانیف ہیں، ان کے مطالعے سے ناظرین خود ہی اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان کا اسلوب ہر صنف کے مزاج کے مطابق ہے یا نہیں؟۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا اسلوب علمی اور ادبی ہے جس میں کوئی تکلف اور تصنع نہیں ہے، اس لیے ان کا اسلوب بھی اس کے لیے موزوں ہے، ''حیات شبلی'' اور ''سیرت عائشہؓ'' ان کی

یادگار تصانیف ہیں، جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

ہاں! ان کے جانشین اور تربیت یافتہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمنؒ کا اسلوب بھی اس کے لیے مناسب ہے، وہ بھی اپنے پیش رو اسلاف شبلی اور ندوی کی طرح اپنے موئے قلم سے حالات و واقعات کی سچی تصویر کھینچتے اور غیر جانب دار ہوکر بے لاگ اپنے مورخانہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت ابوالحسن ہجویریؒ اور صوفی امیر خسروؒ ان کی چند سوانحی تصانیف اور صلیبی جنگ، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری ان کی چند تاریخی تصانیف ہیں، جن میں مولف موصوف نے سوانحی اور تاریخی حقائق بیان کیے اور بے لاگ تاریخ و تذکرہ نگاری کے فرائض انجام دیے ہیں اور اس میں وہی اسلوب اختیار کیا ہے جو اس کے لیے مناسب ہے۔

مولانا معین الدین ندویؒ اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا اسلوب بھی موزونیت کا حامل ہے، اول الذکر کی کتاب ''حیات سلیمانؒ'' اور ثانی الذکر کی کتاب ''تذکرۃ المحدثین'' کے مطالعے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اردو میں اور بھی بہت سے تذکرہ نگار ہیں جن کا اسلوب اس کے لیے مناسب ہے، لیکن راقم نے یہاں سب کا احاطہ نہیں کیا ہے، بس مثالاً ان میں سے معدودے چند تذکرہ نگاروں کے تذکرے قلم بند کردیے ہیں، جو اس کے نزدیک موقع و محل کے لحاظ سے مناسب تھے۔

ماخذ سوانح عمری کے ماخذ حسب ذیل ہیں:

(۱) خودنوشت سوانح عمریاں۔ (۲) روزنامچے، ذاتی ڈائریاں اور نجی خطوط و مکاتیب۔ (۳) [illegible] ملکی، ملی اور دیگر رفاہی کارنامے۔ (۴) متعلقین یا معاصرین کی وہ زبانی یا تحریری روایات جو ان کے مشہور کارناموں کے خلاف نہ ہوں۔ (۵) مولد، مسکن، ماحول، زمانہ اور وہ احوال و ظروف جن میں صاحب سوانح کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما ہوئی اور ان میں ان کی شخصیت پروان چڑھی۔

مراجع

۱ الفاروق، ص ۲۰۔ ۲ مقدمہ۔ ۳ تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۳۔ ۴ ایضاً ص ۶۔ ۵ علم التاریخ عند المسلمین، ص ۴۹۲۔
۶ ایضاً۔ ۷ روضۃ الصفا، ص ۶۔ ۸ ۶۳-۱۲۔

ہشت گلگشت: امیر خسرو کی

ہشت بہشت کی ایک نثری تحریر

پروفیسر شریف حسین قاسمی ☆

امیر خسرو دہلوی کے فن شاعری کو تقریباً ہر صاحب نظر نقاد نے بجا طور پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جب ہندوستان دہلی میں فارسی شاعری کی مکمل تاریخ لکھی جائے گی تو امیر خسرو دہلوی کو اس میں سب سے اہم حیثیت حاصل ہوگی، ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ خسرو کا کلام شروع ہی سے آج تک برابر صاحبان ذوق کی توجہ کا مرکز رہا ہے، ایران ہو یا توران، ہندوستان ہو یا افغانستان خسرو کے کلام کو ہر جگہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور آج بھی اسی انداز سے دیکھا جاتا ہے۔

نظامی گنجوی نے خمسہ نظم کیا اور ایک ایسی ادبی روایت کی بنیاد ڈالی جس کی پیروی کو بعد کے عظیم المرتبت شعرا نے اپنے لیے باعث فخر سمجھا، خسرو دہلوی نے بھی خمسے کی پیروی میں ایک خمسہ نظم کیا جس کی مثنویاں یہ ہیں:

مطلع الانوار، شیرین خسرو، مجنون ولیلی، آئینۂ سکندری اور ہشت بہشت۔

خسرو نے اپنے خمسے میں نظامی کے نقش قدم پر چلنے کی کامیاب کوشش کی ہے، ناقدین فن نے نظامی اور خسرو کے خمسوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے لیکن حقیقت پر مبنی تجزیہ یہی ہے کہ خسرو کا خمسہ نظامی کے خمسے کی ایک بہت اچھی نقل ہے اور نقل کا اصل سے بڑھ جانا عام طور پر مشکل ہوتا ہے، یہ بھی یاد رہے کہ خسرو نے اپنا یہ خمسہ دو سال کے قلیل عرصے میں مکمل کر لیا تھا اور اس کے برخلاف نظامی نے کئی سال میں اپنے خمسے کو مکمل کیا تھا۔

خسرو کے خمسے کی آخری اور پانچویں مثنوی ہشت بہشت ہے، یہ نظامی کی ہفت پیکر کا جواب

☆ دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

اور تین ہزار تین سو پچاس ابیات پر مشتمل ہے، یہ ۷۰۱ھ/۰۲-۱۳۰۱ء میں مکمل ہوئی تھی۔

نظامی کی ہفت پیکر اور خسرو کی ہشت بہشت میں حکمرانی اور عدل کے مسایل سے مفصل بحث کی گئی ہے، امیر خسرو کی ہشت بہشت میں شاعر کا فن اپنے کمال پر نظر آتا ہے، اس کا پلاٹ نظامی کی ہفت پیکر سے مختلف ہے، نظامی کے برخلاف خسرو نے بہرام کا ذکر اس کے بادشاہ بننے کے بعد کیا ہے، خسرو نے سات رنگ برنگے قصے عوامی داستانوں اور قصوں کے ذخیرے سے اخذ کیے ہیں جو نئے اور اچھوتے ہیں، ان میں خیر خواہی، راست بازی، وفا شعاری وغیرہ کی روح رواں ہے، یہ قصے ہفت پیکر کی تقلید میں نظم نہیں کیے گئے، یہاں ہفت پیکر اور ہشت بہشت کا تقابلی مطالعہ پیش کرنا مقصود نہیں، عرض یہ کرنا ہے کہ اس مثنوی کو سید حسین شاہ نے ہشت گلگشت (:) بہرام کے نام سے مسٹر چارلس پیرون کے اشارہ پر نثر میں بیان کیا ہے۔

یہ حقیقت سب پر واضح ہے کہ ہندوستان میں ایک بڑی تعداد ایسے انگریز حاکموں کی رہی ہے جس نے فارسی زبان اور اس کے ادب سے ذاتی اور خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے، ان میں سے بعض نے خود بھی فارسی میں آثار یادگار چھوڑے ہیں اور بعض انگریزوں نے جو ظاہر ہے خود فارسی لکھنے پر قادر نہیں تھے، فارسی میں کتابیں لکھنے کی فرمایش کی اور فارسی میں کتابوں کی تصنیف وتالیف کی سرپرستی کی۔

سید حسین شاہ جنہوں نے ہشت بہشت کو نثر میں بیان کیا ہے، معروف شخص نہیں، ان کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا، البتہ وہ کسی نہ کسی حیثیت سے چارلس پیرون سے وابستہ رہے ہوں گے، وہ کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''......می گوید مستمند عذر خواہ سید حسین شاہ کہ چوں بہ مساعدت طالع ہمایوں بہ ملازمت صاحب والا مناقب...... سلالۂ خاندان فرنگ مستر چارلس پیرون...... رسیدم ومیل طبع سلیم وذہن مستقیمش بہ سوی قصص سلف دیدم روزی تقریباً ذکر ہشت بہشت طوطی ہند اعنی امیر خسرو کہ دراں قصۂ بہرام گور منظوم است، بہ حضور فیض گنجورش گذشت وبرای نثر کردنش ایں ہیچ مداں مامور گشت''۔

''جب میں مسٹر چارلس پیرون کی خدمت میں پہنچا تو محسوس کیا کہ انہیں قدیم قصے کہانیوں سے دل چسپی ہے، ایک روز طوطی ہند امیر خسرو کی ہشت بہشت کا ذکر نکل آیا جس میں بہرام گور کا

قصہ بیان کیا گیا ہے، پیرون نے اس منظوم قصے کو نثر میں بیان کرنے کے لیے مجھے مامور کیا''۔

سید حسین شاہ نے ہشت بہشت کی یہ تحریر ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں مکمل کی، اس ضمن میں انہوں نے یہ قطعۂ تاریخ کہا ہے:

شکر للہ چو بہ اقبال امیر ابن امیر   این طرب خانۂ بہرام کہ انجام نمود
حسب دل خواہ مصنف بہ خدا ہاتف ہم   سال تاریخ طرب خانۂ بہرام نمود

سید حسین شاہ بہر حال ایک شاعر ضرور تھے، اس کے علاوہ وہ ایک کاتب بھی تھے اور انہوں ہشت بہشت کی یہ تحریر خود کتابت کی تھی، اس نسخے کے آخر میں ان کا یہ ترقیمہ ملاحظہ ہو:

"تمام گشت ہشت گلگشت بہ خط ذرۂ بی مقدار مصنف خاکسار بہ تاریخ بیست و ششم ربیع الاول روز یکشنبہ ۱۲۱۵ھ مطابق ہفدہم اگست ۱۸۰۰عیسوی برای نذر گذرانیدن صاحب عالی شان سمو المکان کوہ وقار کاہ نقار انجم خدم سپہر حشم دریا دل حاتم باذل اشجع العصر دانای دہر چارلس اسٹوارت صاحب بہادر دام اقبالہ گر پسند افتد، زہی عز و شرف"۔

اس ترقیمے اور اس تحریر کی تاریخ تحریر سے علم ہوتا ہے کہ جس سال مصنف نے یہ تحریر مکمل کی اسی سال اس کی کتابت بھی تکمیل کو پہنچی۔

سید حسین شاہ نے یہ تحریر سادہ اور سلیس زبان و انداز بیان میں پیش کی ہے، وہ خسرو کی مثنوی کو نثر میں بیان کرتے جاتے ہیں اور کہیں کہیں اس مثنوی سے ایک یا دو بیت بھی حسب ضرورت نقل کرتے رہتے ہیں، مصنف نے عنوان بھی قایم کیے ہیں، مثلاً

گلگشت اول در آغاز داستان   و انجام بنای این بوستان

یا

رفتن بہرام با دلارام بہ شکار نخچیر و تغییر دادن ہیئت دو آہو بہ تیر و سہل گرفتن دلارام آں ہنر را و گذاشتن بہرام او را در صحرا۔

سید حسین شاہ درج بالا عنوان کے بعد، ہشت بہشت کی تحریر اس طرح پیش کرتے ہیں:

خوانندۂ این خط کہن سال   زاں گونہ نمود صورت حال

کہ روزی بہرام بہ عادت معہود با دلارام بہ صحرای رفتہ، ہمچو شیر مست بہ جستجوی شکار

پیوست کہ ناگاہ چند آہو از دور نمایاں گردیدند۔

اسی طرح وہ ''گلگشت ششم؟ در بیان عشرت کردن بہرام در گنبد بنفشہ رنگ، روز چہار شنبہ با صنم رومی شوخ و شنگ'' کو اس طرح ہشت بہشت کے بیت سے شروع کرتے ہیں:

چار شنبہ کہ ہر کشید نوا   مرغ صبح از بنفشہ زار ہوا

بہرام خواست کہ لباس عطاردی پوشد و بہ عیش و نشاط کوشد چوں رنگ کبود گونہ لباس ماتمی بود، قبای بنفشہ گوں پوشید و با گلرخاں رومی در گنبد بنفشجی رفتہ بہ عشرت کوشید، آں ماہ چوں شاہ را دید، از جا برخاست و بر مسند نشانیدہ بزم طرب آراست، شراب و کباب کہ از پیشتر مہیا داشت، آوردہ رو بہ روی شاہ گذاشت، بر پا استاد چوں ساقیان ادب کوش، ساغر پر کردہ بہ شاہ داد و او نوش کرد تا شام ہمیں مشغلہ ماند کہ ساقی بہ ساں مہر و ماہ جام گرداند۔

یہ عبارت عمداً نسبتاً مفصل نقل کی گئی ہے تا کہ بہ آسانی اندازہ ہو جائے کہ مصنف کی زبان بھی اور انداز بیان بھی، دونوں سادہ اور آسان ہیں۔

آسانی سے دست یاب فارسی مخطوطات کی فہرستوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ خسرو کی اس مثنوی ہشت بہشت کو اس سے قبل کسی نے نثر میں بیان نہیں کیا ہے، اس لیے ہشت گلگشت بہرام اس مثنوی کی غالباً پہلی اور آخری تحریر ہے اور اہم بات یہ ہے کہ سید حسین شاہ نے یہ کام ۱۹ویں صدی میں انجام دیا ہے جو فارسی کے زوال کا دور شمار ہوتا ہے، اس دور میں بھی خسرو کے آثار سے دل چسپی ہندوستان کے اس مایۂ ناز شاعر کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

سید حسین شاہ نے اپنی اس کوشش کے آخر میں ''خاتمۂ این طرب خانۂ بی نظیر و عجز مصنف فقیر'' کے عنوان سے لکھا ہے:

الحمد للہ والمنۃ کہ بہ تصدیق روح پر فتوح ائمۂ عالیات و امداد امیر خسرو شیرین حکایات و اقبال صاحب قدر دانِ ہنر شناس ہنروراں:

گشت آراستہ بہ نقش و نگار   روی این کارگاہ جاد و کار
چوں بہ تعمیر این نگار خانہ پر داختم   موسوم بہ ہشت گلگشت ساختم
ای پیر مغاں کنشتم این است   رضوان منم و بہشتم این است

ہر چند من بی استطاعت و بسیار ہیچ مدانِ کم بضاعت کہ خوشہ چیں خرمن استادانم، بل خاک پای شاگردانِ ایشاں، یارا وتواں آں داشتم کہ بنای ایں گلشن بے خار، بر گل تشبیہ و بلبل استعارہ می گذاشتم لیکن چوں صاحبانِ عالی شان کہ غوامض ہر علم را از اغلاق انداختہ اند و ظلمات ہر فن را چوں آب حیات روشن ساختہ، دشوار گذار و سہل پسند اند و باوجود متانت و استحکام ابنیۂ اصول علوم بر دقت نمی نہند، از استعارہ و تشبیہ و کنایہ و تنافر لفظی و تاریکی معنی، نفرت دارند و بہ عبارت سلیس کہ مدعا ازاں بہ سہولت بر آید، رغبت، بنا بر علیہ گرد استعارہ و اصطلاح و لغات نگشتم و از تشبیہ و عبارت آرایی از ابتدا تا انتہا در گذشتم، اگر دشوار پسندانِ اغلاق جو نہ پسندند، معذورم و از طعن شان بہ مراحل دور زیرا کہ طرح ایں صنم خانہ بہار کاشانہ بہ فرمایش صاحب نامدار انداختہ ام و صحن صفا آگین کدورت رفتہ اش را از خار و خاشاک الفاظ درشت و معنی دقیق غور طلب کہ بہ پای مدعا آسیب رساند پرداختہ از فور نضارت و طراوت باغ ارم است۔

مصنف کے اس بیان میں دو باتیں بہت اہم ہیں اور توجہ طلب بھی، پہلی بات یہ کہ صاحبان عالی شان یعنی انگریزوں نے ہر علم کے مشکل نکات کو دور کر دیا ہے اور ہر فن کی تاریکی کو آب حیات کی طرح روشن کر دیا ہے، یہ مشکل پسندی کو ناپسند کرتے ہیں اور سہل نگاری کو پسند کرتے ہیں، متانت و استحکام کے باوجود، علوم کی عمارت کی بنیاد مشکل انداز بیان پر نہیں رکھتے، استعارے، تشبیہ، کنایے اور تنافر لفظی اور معنی کے ابہام سے نفرت کرتے ہیں اور سلیس عبارت جس سے مدعا آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے، ان کو مرغوب ہے، اسی لیے میں نے استعارے، اصطلاحات اور الفاظ کے کھیل سے پرہیز کیا ہے اور ابتدا سے انتہا تک تشبیہ و عبارت آرائی سے گریز کیا ہے حالاں کہ میں رائج اسلوب میں اظہار خیال کی استعداد رکھتا ہوں۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ فارسی لکھنے کا ہمارا اسلوب جسے سبک ہندی کہتے ہیں، انگریزوں کو ناپسند تھا، اس حقیقت کی روشنی میں غالب کے انگریزوں کی مدح میں قصاید اور خطوط جو سبک ہندی کے اچھے نمونے ہیں، ان کو خود غالب کے ممدوح کس نظر سے دیکھتے ہوں گے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے قصاید اور دیگر تحریریں اپنے اسلوب نگارش ہی کی وجہ سے بے اثر رہی ہوں اور ان کا خاطر خواہ جواب نہ ملا ہو۔

اب اسی عبارت کی دوسری بات پر توجہ فرمائیے، سید حسین شاہ لکھتے ہیں کہ:

اگر دشوار پسند طبیعتیں اور مشکل پسندی کے حامی میری سادہ بیانی کو ناپسند کریں تو میں معذور ہوں اور ان کے طعنوں تشنوں سے کوسوں دور۔

یعنی یہ وہ دور تھا کہ لکھنے والے زبان و بیان میں تعقید کو بہ نظر احسن دیکھتے تھے اور جو لکھنے والے اس گلے بندھے اسلوب سے انحراف کرتے تھے ان کا مذاق اڑایا جاتا تھا، سبک ہندی کی بنیاد ہی تشبیہ، استعارے اور دیگر صنایع بدایع پر رکھی گئی ہے، اس سے درگزر ناعیب اور اس کی پابندی رواج وقت تھا۔

چوں کہ سید حسین شاہ نے معاصر اسلوب سے انحراف کیا ہے، اس لیے بھی ان کی یہ کوشش خاص اہمیت کی حامل ہے۔

سید حسین شاہ خسرو کی ہشت بہشت اور اپنی ہشت گلگشت کا ان الفاظ میں مقابلہ کرتے ہیں کہ:

طوطی ہند کی ہشت بہشت اگر چہ ہفت پیکر نظامی کی تقلید ہے لیکن یہ سراسر نغز گوئی کا ایک اچھا نمونہ ہے اور سچ یہ ہے کہ ہشت بہشت مغز ہے اور میری کوشش پوست ہے لیکن

پوست گر چہ چو مغز شیریں نیست   بہر آں مغز، پوست بہ زیں نیست

میں نے یہ غلط کہا اور سچ کو چھپایا ہے اور باطل کو ظاہر کیا ہے، ہشت بہشت آفتاب ہے اور میری ہشت گلگشت سہا، وہ آب حیات ہے اور یہ سراب، میری کوشش کی حیثیت ایسے کنکروں (خزف پاروں) کی ہے جنھیں در شاہوار کے ساتھ پرو دیا گیا ہے، یہ تو وہ کانٹے دار گھاس پھونس کی باڑ ہے جو باغ کے گرد لگادی گئی ہے، اس کے باوجود قدر دان واقف ہیں کہ اس کام کو انجام دینے میں راقم نے کیا کیا زحمتیں نہیں اٹھائی ہیں اور ایک ایک فقرہ لکھنے میں کیسی کیسی مشقتیں نہیں اٹھائی ہیں۔

مصنف کی اصل فارسی عبارت یہ ہے:

نی نی غلط گفتم و باطل ظاہر کردہ حق نہفتم، ایں سہا ست و آں آفتاب، آں آب حیات است و ایں سراب، خزف ریزہ در سلک در شاہوار ست و پرچین خار و خسی گرد گلزار، تاہم قدر داں داند چہ محنتہا کہ نہ اندوختہ ام و در تلاش یک یک فقرہ چہ نفسہا کہ نسوختہ۔

سید حسین شاہ کی یہ ادبی کوشش قابل قدر ہے، اس کام کو انجام دینے میں جو دل چسپی انھوں نے دکھائی ہے اور جو لازمی توجہ برتی ہے، اس نے خسرو کی ہشت بہشت کی اس نثری تحریر کو ایک ادبی شہ پارے کی شکل دی ہے، اسے خسرو شناسی میں ایک اضافے کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔

ماخذ

۱- اک: فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، کتاب خانہ جامعہ ہمدرد، تغلق آباد، مرکز تحقیقات فارسی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۵۸، شمارہ ۱۰۵۳، اس نسخے کا سایز ۱۲×۱۸ ہے، اس میں ہر صفحے پر ۱۱ سطریں ہیں اور کل اوراق کی تعداد ۱۰۵ ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

از:- جناب عطاء اللہ صاحب☆

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے قدردانوں میں بہت کم لوگوں کو ان کے خاندانی اور ذاتی حالات کا صحیح علم ہے، ان حضرات کی غلط بیانیوں کا سلسلہ ان کی زندگی ہی میں شروع ہوگیا تھا جس کی ڈاکٹر صاحب کو خود تردید کرنی پڑی تھی، چنانچہ بہت پہلے حیدرآباد دکن کے روزنامہ سیاست میں ۱۲؍جولائی ۱۹۸۱ء کو ''جلاوطن'' کے عنوان سے ان کے بارے میں ایک مضمون شایع ہوا تو اسی روزنامہ میں ڈاکٹر صاحب کا حسب ذیل خط شایع ہوا:

''حسن الدین احمد صاحب کا بیان کہ میں لکچروں کے معاوضے اور کتابوں کے حق تالیف پر گزر کرتا ہوں، بالکل غلط ہے مجھے ان سے ایک پائی کی بھی آمدنی نہیں ہوتی، گزراوقات کا خدانے دوسرا انتظام کیا، حکومت فرانس کی ملازمت کا وظیفہ ملتا ہے، اس مضمون میں مجھے کوئی فایدہ نظر نہیں آتا، اس میں متعدد واقعات غلط بیان ہوئے ہیں، براہ کرم اپنے اخبار کے مراسلہ کالم میں شایع کر کے ممنون کریں گے''۔

کراچی کے مجلّہ عثمانیہ نے اپریل تا جون ۱۹۹۷ء میں گوشہ حمید اللہ شایع کیا جس کے ایک مرتب مظہر ممتاز قریشی ہیں (ارمغان میں جن کے نام آئے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ کے خطوط شایع ہوئے ہیں) مجلّہ میں حسن الدین صاحب کا یہی مضمون دوبارہ شایع ہوا تو اس میں بھی یہی غلطیاں شامل تھیں، علاوہ ازیں اس میں ڈاکٹر صاحب کا فوٹو ''چہرہ نما محقق ڈاکٹر حمید اللہ'' بھی شایع کیا گیا ہے، یہ مجلّہ جب ان کی نظر سے گزرا تو تحریر فرمایا:

''نہ تصویر میری ہے اور حالات یہ کسی اور حمید اللہ کے بارے میں لکھا ہوگا''۔

☆ 10270- Poplar Lake Dr Jaekson Ville FL 32257, USA

اب ان کے انتقال کے بعد بہت سے رسالے اور بعض ذمہ دار حضرات بھی مجلّہ کے حوالے سے ان ہی غلطیوں کو اپنی تحریروں میں دہرائے جارہے ہیں، ذیل کے مضمون کا مواد صرف ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مختلف مضامین اور تحریروں سے جمع کیا گیا ہے تاکہ ان پر ریسرچ کرنے والے صحیح واقعات کے حوالے دے سکیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنا نام محمد حمید اللہ بتایا ہے اور اپنی ولادت ۱۶؍محرم ۱۳۲۶ھ/۱۳۱۷ف مطابق ۱۹؍فروری ۱۹۰۸ء چہارشنبہ کی رات بلدہ حیدرآباد میں بتائی ہے، ان کے والد ابو محمد خلیل اللہ وظیفہ یاب مددگار مال گزاری عرصہ تک محکمہ عدالت میں کارگزار رہے، فرماتے ہیں:

''میں قاضی بدرالدولہ مرحوم کا پوتا اور خلیل اللہ مرحوم کا بیٹا ہوں''۔

ڈاکٹر صاحب کے دادا محمد صبغۃ اللہ بدرالدولہ قاضی الملک صفدر جنگ نے اردو میں فیض الکریم کے نام سے ایک ضخیم تفسیر لکھنا شروع کیا تھا، پردادا کا نام مولوی محمد غوث شرف الملک ۱۱۶۶-۱۲۳۸ تھا، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: جب مفتی سعید حیدرآباد کی عدالت عالیہ میں مفتی بنے توانہوں نے دارالشفا کے محلے میں ایک مکان خریدا اور وہیں رہنے لگے، پھر ان کے بھائی حسین عطاء اللہ صاحب آئے تو وہ ترپ بازار میں رہے...... پھر سب سے چھوٹے بھائی ابو محمد خلیل اللہ بھی حیدرآباد آئے تو وہ ترپ بازار کے قریب کٹلمنڈی میں مکان لے کر رہنے لگے جو حضرت حبیب علی شاہ صاحب کی درگاہ کے سامنے تاحال موجود ہے، میں (ڈاکٹر حمید اللہ) وہیں پیدا ہوا، والد صاحب مرحوم کو فن تعلیم سے بہت دل چسپی تھی اور بچوں کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں جواب بھی کارآمد ہیں، میری بڑی بہن امۃ العزیز مرحومہ عربی کی ماہر بلکہ مجھ سے زیادہ عربی جانتی تھیں۔

چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہوا تو بسم اللہ کی تقریب ہوئی جو تعلیم کا آغاز ہے (سورہ اقراء کی ابتدائی ۵ آیتیں کوئی بزرگ آہستہ آہستہ پڑھتے ہیں اور بچہ ان کو لفظ بہ لفظ دہراتا ہے، مجھے یاد ہے یہ والد صاحب مرحوم نے کیا تھا لیکن یہ آیتیں مجھے پہلے سے زبانی یاد تھیں جیسے ہی والد صاحب نے شروع کیا تو میں نے فرفر سب پڑھ ڈالیں......، کچھ عرصہ بعد مجھے بڑے بھائی کے ساتھ گھر سے دور مشہور مدرسہ دارالعلوم (حیدرآباد دکن) میں جو چارمینار کے قریب تھا داخل کردیا گیا، اردو مڈل جماعت ششم تک وہیں تعلیم ہوئی، نواب بہادر یار جنگ مرحوم بھی وہیں آتے تھے،

پھر میں مدرسہ نظامیہ بھیج دیا گیا تا کہ عربی پڑھوں، وہاں چند سال رہا پھر والد صاحب کی اطلاع کے بغیر مخفی طور پر صرف انگریزی امتحان دے کر میٹرک پاس کیا۔

جامعہ عثمانیہ سے شعبہ دینیات میں فقہ میں ام، اے کیا اور اسی سال ال، ال، بی سے فراغت حاصل کی پھر نو تاسیس شعبہ تحقیقات میں کام کرنے اور مواد کی تلاش میں بیرون ہند کا سفر کیا۔

جامعہ عثمانیہ میں تحقیقات علمیہ کی جماعت کا آغاز ۱۳۳۹ف میں ہوا اور جس واحد طالب علم (محمد حمید اللہ) سے اس کی ابتدا ہوئی، اس کے مضمون اسلامی قانون بین الممالک کی نوعیت کے لحاظ سے شعبہ قانون و دینیات کی مشترکہ نگرانی سپرد کی گئی، اس کے ایک سال بعد اس کے لیے تفصیلی قواعد اور وظائف منظور ہوئے۔

امتحان ام اے (فقہ شعبۂ دینیات) جامعہ عثمانیہ میں ۱۳۴۰ف میں درجہ اول میں کامیاب ہونے کے بعد مجھے کلیہ جامعہ عثمانیہ اسلامی و یورپی قانون بین الممالک پر تحقیقات کے لیے ۷۵ روپیہ ماہانہ ایک وظیفہ تعلیمی دو سال کے لیے عطا ہوا، ایک سال کے بعد میری درخواست (پر) مجھے اجازت دی گئی کہ مشرق قریب کے ممالک کی سیاحت کرکے وہاں کے کتب خانوں میں اپنے مقالے کے لیے قلمی کتابوں سے مزید مواد فراہم کروں، اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جب میں استانبول میں تھا تو جامعہ بون کے پروفیسر کرینکو نے مجھے وہاں آنے کی ترغیب دی اور کلیہ جامعہ عثمانیہ نے بھی نہایت مہربانی سے مجھے اجازت دی کہ اس کے لیے زیر تیاری مقالہ میں جامعہ بون کو پیش کروں، اس نے میرے وظیفہ تعلیمی میں مزید ایک سال کی توسیع کی اور اسے جرمنی کو بھیجتی رہی، صرف ۹ ماہ قیام کے بعد میرے مقالے کی تکمیل اور میری عام قابلیت کے باعث جامعہ بون نے مجھے وقت کی کثیر رعایت کے بعد مقالہ پیش کرنے کی اجازت دی...... پی، ایچ، ڈی☆ کے امتحان میں میری کامیابی "نہایت عمدہ" رہی اور میرا مقالہ "عمدہ" سمجھا گیا، اس کا عنوان اسلام کے بین الاقوامی قانون☆☆ تھا، میرا امتحان حسب ذیل تین مضامین میں لیا گیا تھا۔

۱-امور اسلامیہ (مسلمانوں کی دینیات تاریخ ادارے وغیرہ)۔

۲-لسانیات (عربی، عبرانی اور سریانی)۔

☆ڈی فل Doktors Der Philosophie

☆☆ Die Neutralitat Im Islamischen Volkerrecht

۳-یوروپی قانون بین الممالک......

اس کے بعد جامعہ پارس سے ڈی لٹ کے امتحان میں کامیاب ہوا...... میرا تقریری امتحان جنوری کے اواخر میں مقرر ہوا، چنانچہ ۳۱ رجنوری ۱۹۳۵ء یعنی کل صبح ساڑھے نو بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک تین ممتحنوں خوشے، دنابنس اور ماسنون کی جیوری کے سامنے میں نے جلسہ میں شعبہ ادبیات کے کمرہ اجتماع میں تقریریں کیں، پہلی تقریر جو ایک گھنٹہ سے زاید رہی، اپنے مقالے عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری Documents Sur La Diplomatie Musulmane a l'EpoQue du Prophete et des Khalifes Orthoxes ابتدائی اسلامی سیاسیات مستنبطہ نتائج کی تائید وتوضیح میں کی، تینوں ممتحنوں نے باری باری سے میرے مقالے پر تنقید و جرح کی اور سوالات کیے، ان کا جواب دینے کے بعد مجھے حسب ذیل دو تقریریں کرنی پڑیں جن میں ایک گھنٹے سے زاید لگا۔

۱-قدیم عربی میلے (اسواق العرب)۔

۲-غیر جانب داری اسلامی قانون بین الممالک میں۔

ان تقریروں پر بھی جرح و تنقید ہوئی اور مجھے بہت سے سوالات کا جواب دینا اور اعتراضات کو رد کرنا پڑا، اس کے بعد جیوری علاحدہ کمرے میں چلی گئی دس منٹ کی خفیہ بحث و تمحیص کے بعد پھر جلسہ گاہ میں آئی اور صدر جیوری پروفیسر خوشے نے مجھ سے مخاطب ہوکر اعلان کیا کہ جامعہ پاریس نے مجھے Doctor es Lettres (ڈی لیٹ☆) کی ڈگری عطا کی ہے اور یہ کہ میں نے یہ امتحان نہایت اعزاز Tr'es houorabli سے کامیاب کیا ہے، جیوری نے پر خوش الفاظ میں میرے مقالے کی جلسہ عام میں تعریف کی اور مجھے مبارک باد دی...... اس کے بعد ارادہ ہوا کہ روس جاؤں لیکن وظیفہ تحقیقات علمی ختم اور بند ہوجانے سے ایسا نہ کرسکا اور حیدر آباد آگیا، مجھے لینے کے لیے والد صاحب مرحوم بھی محبت میں ریل کے اسٹیشن پر آئے، ان کا گلے لگانا میں اب تک

☆ڈاکٹر حمید اللہ نے جس مقالے (سیاسی وثیقہ جات......) پر ۱۹۳۵ء میں سوربون یونیورسٹی سے پوسٹ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، اسی مقالے اور اسی یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا جیسا کہ لوگوں نے لکھا ہے۔ (عطاء اللہ)

بھول نہ سکا......۔

۱۳۴۴ف میں وطن واپسی پر شعبہ دینیات میں تقرر ہوا لیکن ساتھ ہی ہفتے میں چند گھنٹے بہ طور خاص شعبہ قانون میں لکچر بھی دینے پر مامور ہوا، ڈاکٹر سیادت علی خاں صاحب کی محکمہ عدالت میں منتقلی پر کلیہ شعبہ قانون میں لے گئے جہاں قال حال (۱۹۴۴) کارگزار ہیں☆، ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

"......جب تک حیدرآباد میں رہا بار بار ریل کے سفر سے مدراس جاتا رہا وہاں مدرسہ محمدی وجود میں آچکا تھا، میں نے وہاں تعلیم تو نہیں حاصل کی لیکن وہاں بزرگ رشتہ داروں میں مفتی محمود صاحب (شمس العلما) قاضی عبید اللہ صاحب☆☆ عبدالرحمن صاحب منتظم مدرسہ اور دیگر شیوخ و اساتذہ سے ملتا اور فیض حاصل کرتا رہا...... مدراس سے روابط کے سلسلہ میں اتفاق کی بات ہے کہ میرا اولین مطبوعہ مضمون تھا "مدراس کی سیر" جو لاہور کے ہفتہ وار اخبار نونہال جلد ۵/۱ ۱۹۲۴ء نمبر ۷-۷ میں شایع ہوا اور پہلا انگریزی مضمون مدراس ہی کے انگریزی اخبار ڈیلی ایکسپریس فروری ۱۹۲۹ء میں نکلا تھا، عنوان تھا His Most Exalted Highness جو حکمران حیدرآباد کے متعلق تھا، سقوط حیدرآباد سے کچھ قبل ان کی خدمات محکمہ خارجہ میں کر دی گئیں۔

......عربی فرانسیسی اور جرمن ترکی وغیرہ میں میرے علمی کاموں کا ذکر یہاں بے محل ہوگا، میں نے ۳۵ سال پہلے چینی زبان کی تعلیم حاصل کی، ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں عبرانی سیکھی تھی، ۱۹۳۹ء میں آکسفورڈ میں کتبات مدینہ پر لکچر دیا تھا۔

یورپ سکونت کے بعد فرانس کی یونیورسٹیوں میں بھی غیر تدریسی خدمات انجام دیں،

☆ سقوط حیدرآباد کے بعد یورپ میں ڈاکٹر صاحب کا قیام ہوا تو ان کے چچا مفتی محمود صاحب نے ہدایت کی کہ تم نے فرنگی زبانوں کو سیکھ لیا ہے تو ان میں تبلیغ کرو، اس وقت ڈاکٹر صاحب کی وہ تحریر موجود نہیں ہے اس لیے اس کے حوالے سے تفصیل نہیں دی گئی، اسی طرح قرآن مجید کی قرأت کی سند مدینہ سے حاصل کی جو ان کی سب سے اہم سند ہے جس سے ان کی قرأت درست ہوئی، یہ واقعہ سب کے لیے قابل غور اور سبق آموز ہے۔ (عطاء اللہ)

☆☆ مفتی محمود اور قاضی عبید اللہ دونوں چچا تھے۔

فرانس کے Center National de la Rechrch Scientifique سے وابستہ رہے، علاوہ ازیں یورپ اور ایشیا کی کئی یونیورسٹیوں میں توسیعی لکچر کا سلسلہ جاری ہے (تھا)، میں نے فرانس میں کبھی کوئی تدریسی خدمت انجام نہیں دی، میں پروفیسر ماسیس بون کے ساتھ کبھی رفیق کار نہ رہا، میں وزارت تعلمات فرانس کے مرکز تحقیقات علمیہ میں ملازم رہا جس میں تدریس نہیں ہوتی بلکہ غریب اہل علم کو مالی مدد کی جاتی ہے...... فرانس میں لاکھوں مسلمان رہتے ہیں، جب اسلامک کلچر سنٹر نامی انجمن قایم کی گئی، اس وقت مسلمانوں کی ایک بھی انجمن نہیں تھی، اب کئی سو انجمنیں قایم ہوگئی ہیں، ہماری انجمن میں لکچروں کا انتظام ہے اور کتابیں شایع کی جاتی ہیں......۔

ہر روز کثرت سے فرنگی مسلمان ہو رہے ہیں، انگلستان فرانس جرمنی سوئزرلینڈ ہالینڈ بلجیم ڈنمارک شمالی اور جنوبی امریکہ کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے پتا چلایا کہ ان کا ۹۹ % حصہ تصوف اور صوفیہ کی تعلیم کے باعث اسلام قبول کر رہا ہے، عقل پرستوں کی لایعنی تفسیروں اور تحریروں کے باعث نہیں، مسلمان صوفیہ کی چیزیں اب آہستہ آہستہ فرنگی زبانوں میں ترجمہ یا تالیف ہو رہی ہیں، اسلام دل کے راستہ سے ہی پھیل سکتا ہے، دل کی زبان میں تاثیر ہے جو سحر ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں ہم جس کی نقالی کرنا چاہتے ہیں وہ خود اپنے آپ سے اب بیزار ہو گیا ہے۔

ناچیز راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ۱۹۹۵ء تک شایع ہونے والے ڈاکٹر صاحب کے مضامین اور کتابوں کی فہرست کی جو نقل راقم کے پاس ہے وہ تقریباً ۸۰ صفحات پر ہے جس کا اس مضمون میں شامل کرنا طوالت کی وجہ سے ممکن نہیں، رشید شکیب مرحوم نے جن کتابوں کی فہرست دی ہے کچھ تو وہ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں ہی نہیں ہیں مثلاً سیرۃ طیبہ، عثمانیہ یونیورسٹی کے لکچر، اسلام کے بیرونی ممالک سے تعلقات (انگریزی) یعنی Foreign Relations of The Prophet Muhammad with the Contries of Middle-East, India, Turkistan & China Etc. (The Institute of Indo-Middle East Cultural Studies, Hyderabad). جامعہ نظامیہ کے لیے ایک جدید نصاب وغیرہ وغیرہ

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی متعدد کتابوں کی وضاحت میں بھی غلطیاں کی گئی ہیں، اس لیے ان کے بارے میں درست معلومات عرض کرنا ضروری ہوتا ہے:

۱-مصحف عثمانی: زارروس نے اس کا فوٹو لے کر بلاک سے چھپوایا تھا، اس قدیم تحریر کے ساتھ مروجہ عربی رسم خط میں سورۃ نمبر دے کر شائع کیا (قدیم تحریر میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی اور نہ نقطوں اور اعرابوں کا اس میں اضافہ کیا گیا)۔

۲-القرآن فی کل لسان: پہلا اڈیشن ۱۳۶۴ھ ۲۳ زبانوں دوسرا ۱۳۶۵ھ ۴۳ زبانوں کے ساتھ، تیسرا ۶۷ زبانوں کے مواد کے ساتھ اب تقریباً سوا سو زبانوں کا مواد اور سورہ فاتحہ کا ترجمہ موجود ہے لیکن شائع نہیں ہوا۔

۳-محمد رسول اللہ ﷺ: فرانسیسی میں آنحضرت ﷺ کی سیرت دو جلدوں میں۔

۴-محمد رسول اللہ ﷺ: انگریزی میں ایک جلد، یہ فرانسیسی کا ترجمہ نہیں ہے، حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔

۵-محمد رسول اللہ ﷺ: (اردو) یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ ہے مترجم نذیر حق صاحب۔ ترکی میں اس کتاب کا جو ترجمہ شائع ہوا ہے، اشاعت سے پہلے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اسے ملاحظہ نہیں فرمایا تھا، اس لیے وہ اس کی صحت کے ذمہ دار نہیں۔

۶-صحیفہ ہمام بن منبہ: اصل عربی کتاب دمشق سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔

۷-صحیفہ ہمام بن منبہ: محمد حبیب اللہ صاحب نے اردو ترجمہ کر کے حیدرآباد سے شائع کیا تھا۔

۸-صحیفہ ہمام بن منبہ: انگریزی میں اردو سے منتقل کیا گیا ہے، جس میں بہت سے فوٹ نوٹس کا اضافہ بھی ہے لیکن مترجم عبدالرحیم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو مطلع کیے بغیر ہی اسے شائع کیا تھا، صحیفہ ہمام بن منبہ کے جرمن، فرانسیسی اور ترکی میں بھی ترجمے ہوئے ہیں جن میں چنداں کی اجازت کے بغیر کیے گئے ہیں اور غلط بھی ہیں۔

۹-الوثائق السیاسیة فی العهد النبوی والخلافة الراشدة: یہ ڈی لٹ کا مقالہ ہے جو فرانسیسی میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۵ء فرانس سے شائع ہوا، نامکمل ہے۔

۱۰-اور عربی میں مزید اضافوں کے ساتھ پہلی مرتبہ مصر سے شائع کیا۔

۱۱-الوثائق کا اردو ترجمہ (ناقص)۔

۱۹۹۵ء تک شائع ہونے والے کتابوں اور مضامین کی فہرست جو تقریباً ۸۰ صفحات پر محیط ہے تحریر کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔

مراجع وحوالے

(۱) اکیس سالہ تذکرہ شعبہ قانون جامعہ عثمانیہ ۱۳۶۳ھ م ۱۹۴۴ء حیدرآباد، اساتذہ قانون ص ۳۵، تحقیقات علمیہ مرتب کردہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ص ۲۰-۲۱۔

(۲) تفسیر حبیبی عرض حال ڈاکٹر حمید اللہ ۱۴۱۲ھ حیدرآباد ص ۱ تا ۱۵۳۔

(۳) یادگار نمبر بہ تقریب جشن صد سالہ مدرسہ محمدی ۱۴۰۹ھ مدراس، مدرسہ محمدی مدراس اور اس کا پس منظر از محمد حمید اللہ بن ابو محمد خلیل اللہ، ص ۱۴ تا ۳۳۔

(۴) خط کا مسودہ بنام عثمانیہ یونیورسٹی۔

(۵) خط کا مسودہ بنام جناب صدر صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن جہاز اسٹرات ہیرڈ یکم فروری ۱۹۳۵ء۔

(۶) خطبات بہاول پور مولف کی نظر ثانی شدہ اشاعت، اسلام آباد ۱۹۸۵ء۔

(۷) ڈاکٹر حمید اللہ کا خط بنام ڈاکٹر یوسف الدین۔

(۸) جشن نامہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ۱۹۷۲ء، ڈاسر مید الدزبان اور اللہ کا کلام۔

(۹) ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بہترین تحریریں مرتب سید قاسم محمود، پروفیسر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مکاتیب گرامی بنام جناب محمد عالم مختار حق (۲۰۰۳ء، لاہور) خط نمبر ۲۵۔

(۱۰) ارمغان کراچی، جون ۹۶ تا دسمبر ۱۹۹۶ء، غیر مطبوعہ خطوط، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بنام مظہر ممتاز قریشی خط نمبر ۱۸، ص ۹۸۔

اخبار علمیه

ملک عبدالعزیز یونیورسٹی ہاسپٹل سے منسلک ایک پاکستانی کو چند ماہ قبل U-K سے ایسا قرآن پاک حاصل ہوا ہے جواب تک کا سب سے چھوٹا منقش قرآنی نسخہ ہے، یہ ۱۸۹۲ء میں کیرو میں طبع ہوا تھا، اس میں کل ۵۷۱ صفحات ہیں، اس نسخہ کا طول ۷ء۱ سنٹی میٹر، عرض ۲۵ء۱ سنٹی میٹر اور ضخامت ۷ء۲۰ سنٹی میٹر ہے، یہ متروک اور غیر مروج خط مغربی میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کے صفحوں کے نمبر انگریزی اور عربی میں دیے گئے ہیں، اس سے پہلے ہندوستان کی ریاست ہریانہ کے شہر فرید آباد میں بھی ۵۷۲ صفحے کے ایک چھوٹے منقش نسخے کا ریکارڈ گنیش بک میں کرایا جاچکا ہے مگر اول الذکر نسخہ اس سے بھی چھوٹا ہے موخر الذکر نسخہ کی لمبائی ۲۰۳ء۲، چوڑائی ۵۲ء۱ اور ضخامت ۵۱ء۱ سنٹی میٹر ہے، جب کہ چین کا میوزیم بھی قرآن مجید کے چھوٹے اور منقش نسخوں کے لیے خاص طور پر مشہور و معروف ہے اور اس حیثیت سے اس کا نام بھی گنیش بک میں ریکارڈ کیا جاچکا ہے۔

زمین پر پڑنے والی سورج کی کرنوں کو زمین واپس کرتی ہے، پچھلے ۲-۳ برسوں میں اس انعکاس کی رفتار میں تیزی آئی ہے مگر ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں سائنس دانوں نے تیزی کے بہ جائے کمی ریکارڈ کی تھی جس کے سبب ہی سے ان کے خیال کے مطابق زمین کی چمک مدھم پڑنے لگی تھی، زمین کی قوت انعکاس میں کمی اور موسم اور آب و ہوا میں اس قدر تیزی سے تبدیلی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ناسا کے سائنس دانوں نے چاند کے اس حصے کا مطالعہ کیا جس پر سورج کی کرنیں زمین واپس بھیج دیتی ہے حالاں کہ چاند سے پہلے بادلوں پر آفتاب کی کرنیں اور روشنی پڑنے کے امکانات واضح ہیں، سائنس دانوں کے خیال میں تین برسوں میں زمین کی رفتار انعکاس میں تیزی گرین ہاؤس گیسوں کے اثر سے آئی ہے، ۹۰-۱۹۸۰ء کی دہائی میں ریکارڈ

کی گئی زمین کی قوت انعکاس میں کمی کے مطالعہ کے دوران سائنس دانوں کو پتا چلا کہ ۲۰۰۱ء سے یہ مخالف سمت میں رواں دواں ہیں، انہوں نے ۱۹۵۰ء کے اواخر سے ۱۹۹۰ء کی ابتدا تک سورج کی کرنوں کے زمین پر کم مقدار میں پہنچنے کا اندازہ لگایا تھا مگر ان کے نئے مطالعہ میں زیادہ مقدار میں پہنچنے کی بات سامنے آئی، اس کی وجہ فضا میں بادل کی کمی بھی ہوسکتی ہے، محققین نے ان ساری تبدیلیوں کا پتا لگانے کے لیے ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۱ء کے بیچ زمین کی چمک کا مطالعہ کیا نیز ناسا کے ذریعہ اکٹھا کیے گئے بادلوں کے ریکارڈ بھی سائنس دانوں نے پیش نظر رکھے، اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۶ء کے دوران زمین کی چمک بہت تیزی سے مدھم ہونا شروع ہوئی، یہ سلسلہ ۲۰۰۰ء تک جاری رہا، ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۳ء کے دوران ۱۹۹۵ء سے پہلے کی طرح زمین کی چمک عود کر آئی لیکن ان تمام اندازوں اور ثبوتوں کے باوجود ابھی تک سائنس داں اس تبدیلی کی کوئی اطمینان بخش وجہ معلوم کرنے سے قاصر ہیں۔

جدہ میں نیشنل گارڈ ہاسپٹل کے شعبہ پرنس نورا آنکولوجی سنٹر کی تحقیق میں سعودی خواتین برقع کے استعمال کے سبب ناک کے کینسر سے محفوظ ہیں، شعبہ نے تین سال قبل اپنی تحقیق کا آغاز کیا تھا، چنانچہ اس نے متعدد دوسرے ممالک میں کینسر میں مبتلا مختلف مریضوں کی تعداد کا باہم موازنہ کرکے یہ دعوا کیا ہے کہ ۲۵% سے زیادہ مرد کینسر کے ہدف ہوتے ہیں، ان کی تحقیق کے مطابق سعودی عورتوں میں ناک کینسر کی مریضہ بہت کم بلکہ نہیں کے برابر ہیں کیوں کہ وہ ابتدا سے ہی نقاب پہنتی ہیں جو انہیں وایرس سے محفوظ رکھتا ہے۔

جنوب مغربی چین کے صوبہ شانکشی میں ایک مندر کے قریب ایش نام کا ایک رواں دار درخت ہے جس کی جڑ میں سات سونایاب کچھوؤں کی کھالیں دست یاب ہوئی ہیں جو ماہرین کے خیال میں ۳ ہزار برس قبل کی ہیں، اکزن ہوا نیوز ایجنسی سے یہ رپورٹ بھی ملی ہے کہ چین ہی کے ضلع قیشان میں زاونگانگ منار کے پاس ۸۲ ریچھ کی کھالیں ہاتھ لگی ہیں، محققین کا اندازا ہے کہ یہ ایک ہزار سات سو سترہ برس قبل مسیح کی ہیں، بیجنگ یونیورسٹی سے ملحق اسکول آف آرکیالوجی اینڈ میوزیولوجی کے معاون پروفیسر نے کہا کہ کچھوؤں کی ان کھالوں کی دریافت سے تحقیق کے اہم مواقع فراہم ہوئے ہیں۔

ڈنمارک کے جزیرہ بالٹک کے مغربی حصہ میں ہیلس اور روئن نام کے دو قصبے ہیں، ان کے درمیان ٹوٹی ہوئی دو چٹانوں پر دو ڈائنا سوروں کے پیروں کے نشان پائے گئے ہیں، علم نباتات کے ایک طالب علم جیسپر میلان نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ ایک سو ستر ملین برس پہلے حجری عہد کے ڈائنا سور کے پیروں کا نشان ہے، رپورٹ کے مطابق جراسک عہد میں بورن ہام موجودہ ڈنمارک ہی روئے زمین پر واقع وہ حصہ تھا جو زیر آب نہیں تھا اور جہاں کی گرم آب وہوا ڈائنا سوروں کی بالیدگی اور نشو ونما کے لیے مناسب تھی۔

اسلامی تعلیم کے موضوع پر مشرق وسطی اور سارے اسلامی ممالک کی بین الاقوامی کانفرنس میں سعودی عربیہ نے بھی حصہ لیا، اس میں تین سو سے زیادہ فضلا اور دانش وروں نے شرکت کی، کئی روز تک مختلف ملکوں میں ہونے والی یہ کانفرنس جکارتا میں اختتام پذیر ہوئی، کانفرنس میں مذہبی تشدد سے احتیاط، باہمی مصالحت ومفاہمت اور دوسرے ممالک بالخصوص مغرب میں اسلام کی عزت و عظمت کی ساکھ برقرار رکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا، یہ کانفرنس آخر سال میں OIK (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کی طرف سے پیش کی گئی تجویز کے ردعمل کے طور پر منعقد کی گئی تھی، اس کے انعقاد وکامیابی کا سہرا جکارتا کے ادارہ نہضۃ العلما کے سر ہے جو انڈونیشیا کا سب سے عظیم مذہبی ادارہ ہے، اس کے کثیر ممبران ہیں، ادارے کا رویہ اپنی حکومت کے ساتھ مخلصانہ ومصالحانہ ہے۔

امریکی سائنس دانوں نے ایسی طبی ٹکنک ایجاد کی ہے جس کے ذریعے سے سوئی کے استعمال کے بغیر ہی مریضوں کو انجکشن دیا جاسکتا ہے، ان کا کہنا ہے کہ گیس کی تیز دھار سے جلد میں ایک ملی میٹر کے پانچویں حصے کے برابر سوراخ کر کے دوا جسم میں پہنچائی جاسکتی ہے، مریضوں کو سوئی چبھنے سے جو درد ہوتا ہے، اس تدبیر سے اس سے نجات مل جائے گی، سائنس دانوں کے اس کامیاب تجربہ کی رپورٹ ''بی ایم سی میڈیسن'' رسالے میں شایع ہوئی ہے، رپورٹ میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ طریقہ مریضوں کے انجکشن کے ذریعہ علاج کرنے کے نظام میں انقلاب لاسکتا ہے۔

ک ۔ ص ۔ اصلاحی

معارف کی ڈاک

ایک اہم مقالہ

۱۰/۴۳/۳ وکاس نگر لکھنؤ

یکم جون ۲۰۰۴ء

بگرامی خدمت المحترم جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب

دار المصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی اصلاحی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، مزاج گرامی۔

مئی کے معارف کے شمارے میں ایک نہایت ہی اہم مقالہ جناب عامر حسینی صاحب کا شایع ہوا، پچھلے دو تین سال کے مطالعہ وغیرہ سے اندازہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ حیرت انگیز طور پر ترقی خاص کی چوکھٹ پر کھڑے انسانیت کو کسی حیات نو لکھنے کی دستک دے رہے ہیں، میں نے اس حیرت کا اظہار کچھ ہی عرصہ قبل اپنے ایک انگریزی مقالے میں Objective Studies کے موقر جریدہ میں کیا ہے۔

یہ دوسرا موقع ہے کہ فاضل مقالہ نگار کی اس تحریر سے تمام باتیں یکجا ہو کر سامنے آگئی ہیں، تحریر بہ عنوان شاہ ولی اللہ کا تصور سعادت مجھے اسی حیرت میں ڈال چکی ہے چوں کہ میرا تعلق باہر کے چند اداروں سے اس نوعیت کا ہے کہ بعض باتوں کو میں Official طور پر عالمی پیمانے پر لانے کا حق دار ہوں، اس لیے ضرورت ہے، شاہ صاحب کے اس فکری پہلو کو ان کوششوں سے وابستہ کر دیا جائے، جو بقائے نوع انسانی کے لیے کیمیا رہی ہیں اور اس لیے کہ عالمی امن کے تصور کو امریکہ کے بہ طور ایک چیلنج کے سامنے لے آیا جائے۔

اس ضمن میں مجھے فوراً جناب عامر حسینی سے رابطہ قایم کر لینا ہے اور ان کی وہ کتاب جلد از جلد حاصل کر لینا ہے جس کا ذکر انہوں نے کیا ہے۔

میں بے حد ممنون ہوں گا اگر آپ اولین فرصت میں آں محترم کا پتہ مجھے بہ ذریعہ واپسی

ڈاک بھیج دیں۔

میں نے فروری میں آپ کا پورے دن انتظار کیا پھر آپ کی جانب سے نہ آنے کی اطلاع کا منتظر رہا، بڑی مایوسی ہوئی، آیندہ لکھنؤ آنے کے پروگرام سے مطلع فرمائیں، میں خود آپ کو لینے کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔

والسلام

احقر

معزز علی بیگ

موازنہ انیس و دبیر کا نیا ایڈیشن

40-41 Imambara lane,

Rasheed Market EXtn.

Delhi - 110 051.

۹ر جون ۲۰۰۴ء

باسمہ سبحانہ و بحمدہ

فاضل گرامی ضیائے معارف اسلامی جناب مولانا ضیاء الدین صاحب قبلہ اصلاحی

زید مجدکم و زاد لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انشاء اللہ مزاج مبارک بخیر و بعافیت ہوگا!

ممنون ہوں کہ آپ نے میری حقیر سی درخواست پر ساہتیہ اکادمی کے دوصد سالہ انیس و دبیر مذاکرات میں شرکت فرما کر اس کے وقار میں اضافہ کیا، اس کی ندامت اپنی جگہ پر ہے کہ آپ جس روز دہلی تشریف لائے اسی روز مجھے پاکستان اور وہاں سے بعض دوسرے ممالک کا سفر درپیش تھا، نہ ملاقات ہو سکی نہ مدارات!

معارف مارچ کے اداریہ سے اندازہ ہوا کہ انیس و دبیر سمینار میں بعض حضرات کے

سوالات یا اعتراضات سے آپ کو تکلیف ہوئی، مجھے اس کا بھی بے حد افسوس ہے لیکن سمیناروں میں سوالات و جوابات تو ایک عام بات ہے[1] آپ نے اپنے مقالے کی جو نقل ہمارے ادارے کو عنایت فرمائی تھی میں نے اسے بھی بہ غور پڑھا، انصافاً آپ کے مقالے پر کسی ایراد و اعتراض کی گنجایش نہیں ہے، کم از کم مجھے آپ کے تمام مندرجات سے حرف بہ حرف اتفاق ہے، مراثی میں کمزور روایات نظم کرنے پر اعتراض کوئی نیا نہیں ہے، وہ بھی آپ نے جس متانت اور غیر جانب دارانہ انداز سے تحریر فرمایا ہے قابل داد ہے، آپ سے پہلے من جملہ اور حضرات کے خود ایک مستند مرثیہ نگار شاعر اور خود مرزا دبیر علیہ الرحمہ کے خلف الصدق مرزا اوج نے اپنے ایک مرثیہ ہی میں جس قدر تلخ و تند و تیز تنقید لکھی ہے صاحب نظر حضرات اس سے اچھی طرح باخبر ہیں۔

آپ نے ''موازنہ'' کا نیا اڈیشن چھاپنے کا اعلان فرمایا ہے، میرے مشورے سے ایک انگریزی کے صاحب قلم موازنہ کا نہایت عمدہ انگریزی اڈیشن تیار کر رہے ہیں، یہ غالباً آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوگا، اسی طرح اس کا ایک فارسی اڈیشن بھی تیار کیا جا رہا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ آپ کا اردو اڈیشن اور یہ دونوں (انگریزی و فارسی اڈیشنز) ۲۰۰۶ء میں ایک ساتھ ہی شائع ہوں ''موازنہ'' کے ''صدی اڈیشن'' کے عنوان سے، چوں کہ آپ مستحضر ہوں گے کہ مولانا شبلیؒ نے موازنہ نومبر ۱۹۰۶ء میں مکمل کیا تھا اور اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۰۷ء میں چھپا تھا۔

یہ خط لکھا رکھا ہی ہوا تھا کہ میرا وہ سفر درپیش ہوا، جس میں حادثہ کی اطلاع آپ کو ملی اور آپ پریشان ہو گئے، بحمداللہ آپ کی دعائیں مستجاب ہیں، میں بہ خیر ہوں اور اب بالکل ٹھیک ہوں، استفسار حال کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

زیادہ عرض ادب والتماس خلوص

ناچیز

عقیل الغروی

دلی

---

۱ تکلیف اس لیے ہوئی کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے مجھے جواب دینے کا موقع نہیں ملا۔ ''ض''

''ملاقاتیں'' پر تبصرہ

۱۶ر جون ۲۰۰۴ء
چاندپٹی، اعظم گڈھ

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید کہ بہ عافیت ہوں گے!

مئی ۲۰۰۴ء کے شمارے میں ڈاکٹر سید عبدالباری کی کتاب ''ملاقاتیں'' پر تبصرہ شائع ہوا ہے، اس کے متعلق مجھ چند باتیں عرض کرنی ہیں:

۱- یہ کتاب دراصل چودہ اشخاص کے انٹرویو پر مشتمل ہے، مولانا ابواللیث ندویؒ سابق امیر جماعت اسلامی ہند سے انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں ہے، ''اگست ۱۹۳۵ء میں میرا داخلہ مدرسۃ الاصلاح میں ہوا اور ۵ سال وہاں تعلیم حاصل کی''، (ص ۲۳۱) اسی صفحے پر ہے...... جی ہاں ۱۹۲۱ء میں ندوہ میں داخل ہوا اور تین سال وہاں اعلا درجات میں تعلیم کی تکمیل کی اور آگے ہے ۱۹۳۴ء میں ندوہ میں بہ حیثیت استاد تقرر رہوا''۔ (ص ۲۳۲)

۲- دوسرے انٹرویو کی طرح محمد مسلم صاحب کے انٹرویو میں ''سوال'' اور ''جواب'' کا التزام نہیں کیا گیا ہے جس سے ان کے حدود متعین کرنے میں قاری کو دشواری ہوسکتی ہے۔

۳- ''میرے قلم کی سیاہی جواب دے گئی تھی اور صفحۂ قرطاس پر اب پنسل سر کھپا رہی تھی'' (ص ۵۸)، ''ایک کمرے میں جو مولانا کا ڈرائنگ روم تھا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کچھ پوچھتا کچھ لکھتا رہا'' (ص ۲۲۸) ان جملوں اور مذکورہ بالا امور پر مرتب اور مبصر دونوں کو توجہ دینی چاہیے تھی۔

۴- ڈاکٹر عبدالباری اس کتاب کے مرتب ہیں، کتاب کے اندر انہوں نے کہیں کہیں اپنے کو مرتب بھی لکھا ہے، ٹائیٹل پر بھی ان کو اپنا نام مرتب ہی کی حیثیت سے لکھنا چاہیے تھا، امید ہے کہ آیندہ اڈیشن میں وہ ان فروگزاشتوں اور تاریخی تسامحات کو ضرور درست کرلیں گے۔

عمیر منظر

ادبیات

غزل

از:- اقبال ردولوی مرحوم☆

اہل دل ہی جہاں سے آتے ہیں
ہم اسی آستاں سے آتے ہیں

ہم بتائیں کہاں سے آتے ہیں
راز یہ رازداں سے آتے ہیں

ہم بھی واقف ہیں خوب واقف ہیں
تیر جس کی کماں سے آتے ہیں

یوں ہی آتے نہیں ہیں یہ آداب
بزم پیر مغاں سے آتے ہیں

ان کی سازش سے سب تمام ہوئے
جو نظر مہرباں سے آتے ہیں

ان سے آتی ہے بو محبت کی
جو بھی کوئے بتاں سے آتے ہیں

گرم جھونکے ہواؤں کے اقبالؔ
آج تو گلستاں سے آتے ہیں

غزل

از:- ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی☆☆

سانحہ کیسے ہوا، کیا اس کا مطلب لکھ دیا
آہ قاتل کو بھی لوگوں نے مہذب لکھ دیا

کیا ہے مذہب؟ اس کو کیا سمجھے گا وہ شیطاں نژاد
صفحۂ دہشت گری پر جس نے مذہب لکھ دیا

اے سگانِ خوانِ مغرب، یہ بھی سوچا ہے کبھی
کیوں مورخ نے چمکتے دن کو بھی ''شب'' لکھ دیا؟

کچھ نہ کچھ تو ذہن میں ہوگا تصور اس کے بھی
خاک کے ذروں کو جس نے ماہ وکوکب لکھ دیا

ہوش ہے کچھ تجھ کو اے خنزیر خواروں کے غلام!
کیوں کسی نے تیرے حق میں مال ومنصب لکھ دیا

جرم جب ٹھہرا کہ لکھیں روز وشب کے واقعات
ہم نے بس افسانۂ زلف ورخ ولب لکھ دیا

جو نہ لکھ سکتا کوئی، ہم نے وہ ''صدق نیش دار''
جانے کس عالم میں، کس مقصد سے اور کب لکھ دیا

کچھ نہ لکھ پائے کتاب حمد میں جب ہم رئیسؔ
لوح سے تمت تلک بس لفظ یارب لکھ دیا

☆ درگاہ شریف، ردولی، ضلع بارہ بنکی، یوپی۔

☆☆ 4/118-A، لوکو کالونی (نئی آبادی)، علی گڑھ-202 002، (انڈیا)۔

مطبوعات جدیدہ

قرآن میں کیا ہے؟: از جناب ابن غوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۳۶۴، قیمت: ۱۲۰/روپے، پتہ: ابن غوری، مولانا محمد علی جوہر اسٹریٹ، نلگنڈا، اے پی اور ہندوستان امپوریم، پتھر گٹی، حیدر آباد، نمبر ۲۔

قرآن مجید کی دعوت اور تذکیر اور اس کے مضامین میں غور و فکر کرنے کی غرض سے تفہیم قرآن کا مبارک سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلے کا نہایت مفید و موثر حصہ ہے جو اصلاً تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد ترویحہ میں تلاوت کیے گئے حصوں کے خلاصے کی شکل میں ہے، فاضل مصنف نے مصلیوں کو اصل مضامین کی روح سے آشنا کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا، زیر نظر کتاب سورۂ کہف تک کے مضامین پر مشتمل ہے، مضامین و افادات کے لیے عصری رعایت اور اس سے بڑھ کر اپنے مذاق طبیعت کی مناسبت سے معارف القرآن اور تفسیر ماجدی کا بہ طور ماخذ اس خوبی سے انتخاب کیا گیا کہ اب یہ کتاب دونوں تفسیروں کا جامع خلاصہ بھی ہوگئی ہے، مضامین میں عبرت و نصیحت کا عنصر غالب ہے لیکن ہر سورت کے احکام و واقعات کا اجمالی اور جامع تعارف بھی آگیا ہے، فاضل مصنف، اسلوب ماجدی کے شیدائی ہیں اور اس کا اثر خود ان کی تحریر سے نمایاں ہے، قرآن مجید کی خدمت جس عنوان سے ہو قدر کے لائق ہے اور یہ کتاب تو واقعی قرآنی تعلیمات کا عطر اور بہ قول مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ''مضامین قرآن کا حسین گلدستہ ہے''، اس کی حیات بخش خوش بو کا اندازہ اس کے مطالعہ سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔

معارف صوفیہ: از جناب مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۵۴۴، قیمت: ۱۵۰/روپے، پتہ: مکتبہ دار المعارف، بی/۶۳۹، وصی آباد، الہ آباد، یوپی۔

تصوف اور تزکیہ نفس کی اصل شکل و روح سے آشنا کرنے اور واقفیت و مناسبت پیدا کرنے

کی غرض سے اس کتاب کے محترم مولف کی مساعی ایک عرصے سے بزرگوں کے اقوال و احوال کے جمع و تدوین کی شکل میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں، ان کا مقصد بھی واضح ہے کہ یہ بس اصلاح احوال و اخلاق کا ذریعہ ہو اور زمانۂ حال میں تصوف کے نام سے عموماً بے رغبتی، بے گانگی بلکہ وحشت کا شافی علاج بھی ہو جائے، زیر نظر کتاب بھی ان کے اسی سلسلۂ اصلاح و تلقین کی ایک کڑی ہے جس میں شیخ عبدالغنی نابلسی، امام عبدالکریم قشیری، مولانا تھانوی، مولانا مدنی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا عبداللہ گنگوہی، مصلح الامت شاہ وصی اللہ، مولانا عبدالباری ندوی اور پروفیسر خلیق نظامی رحمہم اللہ کے مختلف رسایل اور تحریروں کو یکجا کر دیا گیا ہے، اس سلسلے میں بعض عبارتوں کی تسہیل و توضیح بھی خوبی سے کی گئی ہے، تصوف اور نسبت صوفیہ کو سمجھنے کے لیے ان رسایل کی اہمیت محتاج تعارف نہیں لیکن عوام کو ان سے آگہی کم ہی ہے، اس نافع مجموعہ سے یقین ہے کہ ان کا فایدہ عام ہوگا۔

میر و مصحفی: از پروفیسر حنیف نقوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۵۶، قیمت: ۲۰۰/روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی اور مکتبات جامعہ لمیٹڈ۔

میر محمد تقی میر اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی بعض تصانیف اور ان کی شخصیتوں کے بعض پہلوؤں کے متعلق چھ نہایت محققانہ تحریروں کا یہ مجموعہ فاضل مصنف کی ژرف نگاہی اور دقت مطالعہ کا شاہد ہے، دونوں با کمال اساتذہ سخن پر تین تین مضامین ہیں جو مختلف رسایل و جراید میں شایع ہو چکے ہیں، پہلا مضمون میر کے دیوان سوم کے ایک نادر قلمی نسخے کے متعلق ہے جو بنارس ہندو یونی ورسٹی لائبریری کے ذخیرہ لالہ سری رام میں موجود ہے، اس پر متعدد شاہی مہروں کی موجودگی سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ واجد علی شاہ کے دور تک اودھ کے شاہی کتب خانے میں موجود تھا، لیکن چوری کے الزام کے خوف سے اس کی مہروں پر چیپیاں لگا دی گئیں تھیں، جس کی وجہ سے بعض محققین نے اس کے سرورق کی تحریر کو ناقص اور ساقط از اعتبار قرار دیا تھا اور اپنے دعوی کے اثبات میں بعض اور دلایل بھی پیش کیے تھے لیکن فاضل محقق نے اصل مہروں کی بازیافت اور شناخت سے نقص کا الزام ہی رفع نہیں کیا، دوسرے دلایل کا بھی شافی جواب دے کر اودھ کے شاہی کتب خانے سے اس کے تعلق کو قطعی درست قرار دیا ہے، اس کے علاوہ نسخہ بنارس کے بعض امتیازات کا ذکر

بھی ہے، نکات الشعرا کے چند مخطوطات اور میر و انعام اللہ یقین کے عنوان سے بقیہ مضامین بھی مطالعہ و تحقیق اور اخذ نتایج کا بہترین نمونہ ہیں، نکات الشعرا کی اشاعت میں تین مختلف قلمی نسخوں سے مدد لی گئی تھی لیکن فاضل محقق کی نظر میں روس، جرمنی، ملیشیا اور رام پور کے مخطوطات سے اب تک استفادہ نہیں کیا گیا، بیرونی ملکوں کے یہ نسخے خود مصنف کی دسترس میں نہیں لیکن بقیہ نسخوں کا تعارف تفصیل سے ہے، اس میں اختلافات متن کی بحث خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں نکات الشعرا کی تدوین و ترتیب کے باب میں بعض خیالات سے اختلاف کیا گیا ہے مثلاً نسخہ رام پور کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ناقص ہے اور اس کو متن کی تصحیح کے لیے ترجیح نہیں دی جاسکتی، درست نہیں ہے، علی گڑھ کے سر سلیمان کلکشن کے چند متفرق اور منتشر اجزا کو نکات الشعرا کا حصہ قرار دیا جانا بھی مصنف کے نزدیک درست نہیں بلکہ وہ اسے کسی کم سواد اور ناپختہ کار شخص کا نتیجہ قلم سمجھتے ہیں، یقین کے معاملے میں میر صاحب کی بے یقینی کی بحث دل چسپ ہے اور فاضل محقق اس قضیے میں بر بنائے سخن فہمی، یقین کے اس حد تک طرف دار نظر آتے ہیں کہ عقدہ کشائی میں ناخنِ تحقیق معطر ہی نہیں رنگین تر بھی ہوگیا ہے، مثلاً یہ کہ "سرقے کے معاملے میں آں جناب (میر) بھی اپنا جواب نہیں رکھتے"، "میر صاحب کا یہ جارحانہ تبصرہ...... خود ان کے دل کے چور کو ظاہر کرتا ہے"، "نیت صاف ہوتی تو...... یقین کو مجرم نہ گردانتے"، مصحفی کے متعلق مضامین میں ان کے سال ولادت، ان سے منسوب دو تذکروں ید بیضا اور نور ازل اور ان کے ایک شاگرد علی بخش بیمار پر بحث کی گئی ہے، یہ تمام تحریریں اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ واقعات و حقایق کی دریافت میں مطالعہ اور استنتاج کا حق ادا کر دیا گیا ہے، اختلاف کی گنجایش کے باوجود محقق کا قلم اپنی دیانت داری کا اعتراف کرنے پر بہ خوشی آمادہ کر لیتا ہے اور یہ دعوی محض دعوی نہیں رہتا کہ "تلاش و تحقیق اور تجزیہ و تنقید کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی گئی"، اردو کے ادب عالیہ کے باذوق قارئین کے لیے یہ مجموعۂ مضامین عمدہ تحفہ ہے، کلام میر و ذکر مصحفی کے مطالعہ و تدوین کے لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے): از جناب مولانا فیصل احمد بھٹکلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۵۸۲، قیمت: ۱۰۰ر روپے، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹، ندوۃ العلما لکھنؤ۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں انگریزوں کے ظلم اور مجاہدوں اور سر فروشوں کی بہادری اور قربانی کی بے شمار مثالیں اب تاریخ ہند کا حصہ بن چکی ہیں، اس تحریک کے عوامل و محرکات میں قریب ڈیڑھ دو سو سال کی مسلسل عوامی بے چینی اور یورپی استعمار کے خلاف روز افزوں نفرت کی مختلف صورتوں کا ذکر کیا جاتا رہا ہے لیکن علماے ہند کی مستقل اور پیہم جد و جہد اور اثرات کا اعتراف اگر کیا بھی گیا تو دبے الفاظ ہی میں، شاید یہی احساس اس کتاب کی وجہ تصنیف بنا، جس میں شمالی ہند سے کیرالا تک مختلف علاقوں میں علما کی تحریکوں اور ان کے اثرات کا تفصیل سے اور بڑی حد تک دستاویزی حیثیت سے احاطہ کیا گیا ہے، اس باب میں سب سے روشن عنوان حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت کے مجاہدانہ کارناموں کا ہے، پرتگالیوں اور انگریزوں کے خلاف کرناٹک اور کیرالا کے علما کی سرفروشی کی داستان سے واقفیت کم ہے، ان کا ذکر اس کتاب کی امتیازی خوبی ہے، شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کے اثرات اور ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے کے معاملے میں شاہ عبد العزیز کے فتوی کو اصل الاصول بتایا گیا لیکن کتاب کے صاحب تقریظ کا احساس ہے کہ اولیت کا شرف قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو حاصل ہے، ایک باب میں اس قسم کے فتاوی کی مفصل بحث کی گئی ہے، بہار، بنگال، حیدرآباد اور روہیل کھنڈ میں علما کے مجاہدانہ کردار کی بھی تفصیل ہے، کتاب اپنے موضوع سے انصاف کرتی ہے، اسلوب میں جا بہ جا حمیت و غیرت کا خروش نمایاں ہے اور بعض عبارتیں بھی زواید بلکہ حشو میں آجاتی ہیں، سخن ہاے گفتنی میں بعض باتیں بے محل ہیں اور اسی طرح باب اول کی بھی چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن نوجوان مصنف کی محنت اور مطالعہ کی وسعت قابل داد ہے، یہ کتاب ان کے ایک وسیع منصوبہ کی پہلی قسط ہے اس کے بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ اور پھر ۱۹۴۷ء تک عہد بہ عہد علما کی کاوشوں کا احاطہ کیا جائے گا، امید ہے کہ ہر آیندہ نقش خوب سے خوب تر کی مثال ہوگا۔

افکار و احوال: از پروفیسر محمد سالم قدوائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۴۴، قیمت: ۸۰ر روپے، پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامیہ سے ایک علمی رسالہ مجلّہ علوم اسلامیہ اپنے مقالات و مضامین کی وجہ سے قدر کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے، اس کتاب کے فاضل مصنف کی

نگارشات بھی اس کے صفحات کو مزین کرتی ہیں، زیر نظر مجموعہ میں ان کے چند مضامین کو اس ضرورت کے پیش نظر یکجا کیا گیا ہے کہ وہ ''معلوماتی'' ہیں، ان میں کچھ تو معروف شخصیتوں کے احوال پر مشتمل ہیں، مثلاً پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین احمد وغیرہ، یہ گو تاثراتی تحریریں ہیں لیکن سوانحی لحاظ سے بھی کچھ کم مفید نہیں، ان کے علاوہ علمی، تاریخی اور اسلامی موضوعات پر مقالات ہیں، مثلاً ہند اور مہند، دینی نظام تعلیم اور اسلام میں معاشی فکر کی تاریخ اور ہجرت کی تاریخی وسیاسی اہمیت وغیرہ، ان میں معاشی فکر کی تاریخ خاص طور پر اہم اور قابل ذکر ہے جس میں بعض معاصر تحریروں کا جو اردو، عربی اور انگریزی میں ہیں، ان کا جائزہ لیا گیا ہے، ابن خلدون سے علامہ اقبال تک متعدد مشاہیر کے افکار کے جامع ذکر سے یہی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اسلام کی معاشی فکر، مغرب کے نظریہ معاشیات کے مقابلے میں کئی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے، وہ معاشی امور میں انتہا پسندانہ راہ سے گریزاں اور کلیت پسندی اور بے قید انفرادیت سے محفوظ ہے، گو یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اسلام کے نظام معاشیات پر کم لکھا گیا جس کی وجہ سے اس فکر کے تجزیاتی پہلو میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے، ایک مضمون فرانس میں دراسات اسلامی اور ہندی مسلمان کے عنوان سے ہے، مغربی استشراق کے حوالے سے یہ مضمون خاصا معلومات افزا ہے، البتہ اس کے تناظر میں ہندی مسلمانوں کا پیوند مختصر ہے اور بے محل بھی، یہ الگ عنوان سے بھی تفصیل سے لکھا جا سکتا تھا، پہلا مضمون مصحف عثمانی کے تاریخی نسخے کے عنوان سے ہے یہ مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کے قلم سے ہے اور معلومات کے لحاظ سے نہایت قیمتی ہے، یہ اس خیال عام کی تردید میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی بار قرآن کریم کو دفتین میں جمع کیا، فاضل مضمون نگار کی نظر میں حضرت عثمانؓ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مصحف صدیقی کی اشاعت عام کی اور تمام مصاحف فردیہ کو یک قلم موقوف کر دیا، مصاحف عثمانؓ کی تعداد میں ان کا پسندیدہ قول یہ ہے کہ یہ کل آٹھ نسخے تھے لیکن بہ وقت شہادت جو مصحف خاص حضرتؓ کے ساتھ تھا، اس کے متعلق کوئی یقینی شہادت ان کے نزدیک نہیں ہے، پروفیسر نجات اللہ صدیقی کے ذکر میں کتابت کی ایک غلطی لائق توجہ ہے، ''سے'' کی بہ جائے ''نے'' نے استاد و شاگرد کی حیثیت ہی بدل دی ہے۔

درد کے خیمے کے آس پاس: از جناب مغنی تبسم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت،

مجلد مع خوب صورت گرد پوش، صفحات: ۲۰۰، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ شعر و حکمت 6-3-695/2، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد نمبر ۸۲ اور سب رس کتاب گھر، پنجہ گٹہ حیدر آباد۔

جناب مغنی تبسم، حیدر آباد کی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ شخصیت ہیں، وہاں کی علمی و ادبی آبرو جن سے قایم ہے ان میں وہ امتیازی شان رکھتے ہیں، تحقیق و تنقید اور تعلیم و ادب کے علاوہ شاعری بھی ان کی شناخت کی نمایاں علامت ہے، مشق سخن سے وہ نوعمری ہی میں آشنا ہوئے، قریب نصف صدی قبل ان کا ایک مجموعہ کلام شایع ہوا تھا، اس کے بعد ان کے دو اور مجموعے شایع ہوئے، زیر نظر مجموعے میں تازہ اور جدید کلام کے ساتھ مطبوعہ مجموعوں کا انتخاب بھی شامل ہے گو اس کی صراحت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، غزلیں زیادہ ہیں لیکن اثر و کیف میں نظمیں کم نہیں، دور جدید اور فکر جدید کے شاعر میں اگر کلاسیکی اقدار کی تقدیس کا بلند پایہ اظہار ہو تو یہ فن کار کی پختگی اور مشاقی اور خود فن کی بلند پایگی کی علامت ہے، نفس کے مشغلہ بے تابی اور اندوختہ دیدۂ تر اور نغمہ آواز پا کے شاعر کا سب سے بڑا وصف اس کی انفرادیت ہے، درد کے خیمے کے آس پاس، شب، خواب، راحت خواب، سحر، صبح شعوری طور پر موجودہ عہد کی روح کی بے قراری، تحیر اور اضطراب و انتظار کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں:

جاگنے کا عذاب سہہ سہہ کر اپنے اندر ہی سو گیا ہوں میں
میں رو پڑا ہوں تبسمؔ سیاہ راتوں میں غروب ماہ میں شاید زوال میرا تھا

جیسے اشعار سے ہر صفحہ پر ثروت ہے، اردو کی شعری روایت کی پاس داری یوں بھی ہے کہ آغاز حمدیہ غزلوں سے ہی ہوا، نعت بھی ہے لیکن اس کا عنوان درود نا رسیدہ رکھا گیا جو نا قابل فہم ہے، شعری مجموعوں کی کثرت میں یہ مجموعہ انفرادی شان کا حامل ہے۔

تاریخ پارے: از جناب مشتاق اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: نصیر بک ڈپو، جی۔ٹی روڈ آسنسول۔

اس کتاب میں تاریخ کے صفحات سے چھوٹے چھوٹے لیکن سبق آموز واقعات اور پر لطف حکایات کا انتخاب کر کے ان کو اگرچہ بچوں کے ذہن و معیار سے پیش کیا گیا ہے لیکن یہ بڑوں کے لیے بھی پر لطف و پر اثر ہیں، کتاب کے لایق مولف اپنے افسانوں اور بچوں کے لیے مضامین کی وجہ سے غیر معروف نہیں، ان کا مشغلہ درس و تدریس کا ہے، اس لیے افہام و تفہیم کے گُر سے بھی وہ

خوب واقف ہیں، تاریخ پارے کے عنوان سے ان کا ایک مستقل کالم بچوں کے رسالہ ''کھلونا'' میں بڑا مقبول ہوا، اب زیر نظر کتاب میں اس کو یکجا کردیا گیا ہے، نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے واقعات بھی اس میں شامل ہیں، اس کے علاوہ علم وادب اور تاریخ وثقافت کی اہم شخصیتوں کے ذکر سے بھی کتاب کو مزین کیا گیا ہے، کتاب کی جاذبیت اور اس کا اثر دونوں ظاہر ومحسوس ہیں، آخر میں ان کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے جن سے اخذ وترتیب میں مدد ملی لیکن بہتر ہوتا کہ ہر واقعہ کے آخر میں ماخذ کا ذکر کردیا جاتا۔

متحرک منظر کی فریم: از جناب معین الدین عثمانی، متوسط تقطیع، کاغذ وکتابت طباعت مناسب، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۳۸، قیمت: ۱۶۰ روپے، پتہ: ادارہ شاہین، ساہو نگر، جل گاؤں، مہاراشٹر۔

جل گاؤں کی اردو نواز بستی میں معین الدین عثمانی کا نام ایک متحرک اور فعال، اردو کے خادم کی حیثیت سے نمایاں ہے، زیر نظر کتاب ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے، چھوٹے بڑے قریب بائیس افسانے ہیں، اردو افسانہ ماضی قریب میں اور آج بھی جن بلندیوں سے آشنا ہوا، اس کے معیار سے گو یہ افسانے فروتر ہیں، مواد اور اہمیت بھی اس درجہ کی نہیں لیکن بعض افسانے تکنیکی اعتبار سے یہ اشارہ ضرور کرتے ہیں کہ اگر مشق جاری رہی تو افسانہ نگار کی شناخت میں دیر نہ ہوگی، اس لیے یہ رائے ہماری بھی ہے کہ ''ان کے افسانوں کی اٹھان ان کے روشن مستقبل کی نشان دہی کرتی ہے''۔

انکور (ہندی): از جناب ڈاکٹر نثار جیراج پوری، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت مناسب، مجلد، صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۶۵ روپے، پتہ: ۶۷، جالندھری، اعظم گڑھ، یوپی۔

نثار جیراج پوری اردو کے صاحب دیوان شاعر ہیں، جدید غزل ونظم گوئی میں وہ مشہور بھی ہیں، مقبول بھی، زیر نظر مجموعہ ہندی میں ان کی شاعری کا نیا روپ ہے جس میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ دوہے بھی شامل ہیں، اردو مزاج وآہنگ سے ہندی قارئین کو واقف کرانے میں یہ مجموعہ اشعار ایک اچھی کوشش ہے۔

ع۔ص

☆☆☆

دار المصنفین کا سلسلہ تاریخ ہند

کتاب	مصنف	Pages	Rs
۱۔ مقدمہ رقعات عالمگیر	سید نجیب اشرف ندوی	492	80/-
۲۔ بزم تیموریہ اول	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	605	150/-
۳۔ بزم تیموریہ دوم	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	266	50/-
۴۔ بزم تیموریہ سوم	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	276	56/-
۵۔ بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	746	140/-
۶۔ ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک	''	524	80/-
۷۔ مختصر تاریخ ہند	سید ابو ظفر ندوی	194	50/-
۸۔ ہندوستان کی کہانی	عبد السلام قدوائی ندوی	70	20/-
۹۔ تاریخ سندھ	سید ابو ظفر ندوی	420	56/-
۱۰۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں اول	ضیاء الدین اصلاحی	410	75/-
۱۱۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں دوم (جدید ایڈیشن)	''	358	125/-
۱۲۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	648	80/-
۱۳۔ بزم مملوکیہ	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	370	70/-
۱۴۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے	ادارہ	354	50/-
۱۵۔ ہندوستان کے سلاطین علماء ومشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	مرتبہ: سید صباح الدین عبد الرحمٰن	238	75/-
۱۶۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں	ترجمہ: علی حماد عباسی	468	56/-
۱۷۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	134	30/-
۱۸۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں اول	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	252	50/-
۱۹۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں دوم	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	180	30/-
۲۰۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	ابو الحسنات ندوی	132	25/-
۲۱۔ عرب وہند کے تعلقات	سید سلیمان ندوی	442	95/-